نگارشات متعلق یادگارِ حسینی

(۱) محرم

اف کتنا دلدوز، کتنا جگر فگار اور کتنا غم انگیز نام۔ آہ کیا ہے کہ اس نام کو سن کر دل پگھلتا اور آنکھیں ڈبڈبائی آتی ہیں؟ کیا ہے کہ آنسو خود بخود چھلکے پڑتے اور دل امڈا آتا ہے۔

یہ آخر اس نام کی تاثیر ہے! اس کی خاصیت ہے یا اس نام کی تحت میں جو معنی ہیں ان کا اثر؟

نہیں یہ کچھ نہیں۔ یہ تو ایک مہینہ کا نام ہے جس سے دور قمری کے سال کی ابتدا ہوتی ہے۔ مگر اس مہینہ کا بھی خاصہ ہی ہے کہ ادھر اس کا چاند فلک پر دکھائی دیا، ادھر ہر طرف نوحہ وبکا شورو شیون کی آوازیں آنے لگیں۔ گھروں میں ماتمی صفیں بچھ گئیں اور اچھے اچھے رنگ برنگ زرق برق کپڑوں کے بجائے سیاہ کپڑے زیب جسم نظر آنے لگے۔ اس چاند کے دیکھتے ہی دلوں پر رنج وغم کا ہجوم ہو جاتا ہے۔ ہنسنے بولنے کو دل نہیں چاہتا اور ہر وقت رونے اور اشک بہانے یا چپ خاموش رہنے کو دل چاہتا ہے۔

مگر مہینے بھی تو آخر دور زمانہ کے مختلف اجزا ہیں اور اس حیثیت سے مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں بھی خود یہ خاصیت چھپی ہوئی نہیں ہے کہ کوئی ان میں سے خوب دلوں کو خوش کرے اور لبوں پر ہنسی لائے اور کوئی رنج وغم کا باعث ہو اور آنکھوں سے آنسو جاری کرے۔

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

لیکن بے شک مہینوں میں کچھ تاریخی واقعے ہوجایا کرتے ہیں۔ جو ان میں کوئی مخصوص اثر مضمر کر دیتے ہیں۔ وہ ان تاریخی واقعات کی یاد ہوتی ہے جو ان مہینوں میں تازہ ہوکر وہی اثر دکھلاتی ہے جو خود ان کے وقوع میں مضمر تھا۔

اب یہ اس واقعہ کی عظمت پر موقوف اور اہمیت پر منحصر ہے وہ جتنا ہی عظیم ہوگا اتنا عرصہ تک اس کا اثر قائم رہے گا۔ اور زیادہ شدت کے ساتھ رونما ہوگا۔

جوان بیٹے کے غم میں بیٹھنے والی ماں کچھ دنوں روزانہ اس کی یاد میں روتی اور پھر ہر ہفتہ اس دن کے آنے پر گریہ کرتی اور اس کے بعد ہر سال اس تاریخ کے آنے پر افسردہ ہوتی ہے، وہ اس کی مجلس فاتحہ خوانی کرتی ہے اور کبھی چند آنسو بہا لیتی ہے لیکن تھوڑا طویل عرصہ گذرنے کے بعد اس افسردگی کا اثر بہت کم ہوجاتا ہے۔ تاریخ کے آنے پر اگر اس کی یاد کا سامان کچھ ہوتا بھی ہے تو وہ صرف رسمی حیثیت میں محدود رہتا ہے لیکن دل پر رنج وغم کا قائم ہونے والا اثر اس صورت سے اب دل غمگین نہیں بناتا جس صورت سے پہلے۔

یہ کلیہ اگر ٹھیک ہے اور ضرور ٹھیک ہے تو بیشک اس محرم میں ہونے والا واقعہ ضرور کوئی ایسا عظیم واقعہ ہوگا جس کی مثال دنیا کے حوادث میں کمیاب نہیں بلکہ معدوم ہے۔

وہ واقعہ اپنی اہمیت، قدرت اور عظمت میں کچھ ایسا ہے کہ اس کی یاد مہینہ دو مہینہ، سال دو سال نہیں بلکہ ایک ہزار تین سو

برس کے قریب ہونے کے باوجود زندہ ہے اور اہل درد کے دل کو اسی طرح برماتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ واقعہ ابھی رونما ہوا ہے۔

ایک خالی الذہن آدمی عراق جائے، ایران جائے، شام جائے، یمن کی سیر کرے، بحرین کی سیاحت کرے، جاوہ میں جا کر قیام کرے، کشمیر، تبت، اور چین کا دورہ کرے اور پھر ہندوستان کے ہر ہر صوبہ، ہر شہر کا جائزہ لے اور اتفاق سے ہر جگہ محرم کا زمانہ پڑے۔ وہ دیکھے گا کہ دنیا کا طول و عرض اس غم انگیز زمانہ میں مرقع رنج وحسرت بن جاتا ہے۔ اور جہاں جہاں پیغمبرؐ اسلام کے عقیدت مند آباد ہیں وہ اس غم انگیز زمانہ میں کسی واقعہ کی یاد کو تازہ ضرور کرتے ہیں۔ یہ کون سا غم انگیز سانحہ ہے اور وہ قیامت خیز حادثہ کونسا تھا جس نے صفحۂ دنیا پر اپنا نہ مٹنے والا نقش چھوڑ دیا ہے۔

سنو اور اگر دل رکھتے ہو تو دل کو سنبھال کر سنو۔

پیغمبر اسلام کا پیارا نواسہ، علیؑ و فاطمہؑ کی آنکھوں کا تارا، خلق کا امام اور دنیائے اسلام کا روحانی پیشوا، حق کا سب سے بڑا فدائی اور مذہب کا سب سے بڑا محافظ تھا جس نے اپنے نانا کے دین، خدا کے سچے مذہب کے لئے کربلا کے میدان میں انتہائی صبر واستقلال، حیرت انگیز سکون واطمینان، تعجب خیز ترتیب وانتظام کے ساتھ وہ عظیم الشان قربانی پیش کی جس کی نظیر نہ اس کے قبل ہوئی تھی اور نہ اس کے بعد۔

رسول خدا کے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کو اکسٹھواں سال تھا جب دسویں تاریخ محرم کو حسینؑ، بے کس مظلوم امام تیس ہزار کوفی فوج کے سمندر میں گھر گیا تھا۔ تلواروں نیزوں کی چمکتی بجلیوں، دہل جنگ کی فلک شگاف گرج اور ڈھالوں کے گھٹا ٹوپ بادل میں آسمان نبوت کے ستارے اپنی آخری روشنی پہنچا رہے تھے۔

موعظہ ونصیحت میں کوتاہی نہ تھی اور اتمام حجت کی منزلیں طے ہو رہی تھیں مگر گھٹا، وہ عظیم گھٹا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ ڈھالوں کی گھٹائیں، کالے نشانوں اور ان کے پھر ہروں کی گھٹائیں، خود فوج کی کثرت کی سمندر کی طرح بڑھتی ہوئی گھٹائیں بلکہ گمراہی وضلالت کی گھٹا، جہالت وکورچشمی کی گھٹا۔ اس میں ہدایت کی تیز ترین شعاعیں بے نتیجہ اور موعظہ ونصیحت کی روشن ترین ضوفشانیاں بالکل بے اثر ثابت ہوتی تھیں۔ آخر اتمام حجت کے تمام درجے ختم ہو گئے اور موعظہ ونصیحت کے سب ذرائع تمام ہو گئے۔

پامالی، احکام مذہب کی پامالی، دین خدا کی پامالی اور شعائر اسلام کی پامالی اس کو حسینؑ گوارا نہ کر سکتے تھے۔

یزید کی اخلاق سوز، مذہب شکن، کفر خیز اور باطل پرور حکومت میں اسلامی خلافت اگر بالکل تسلیم ہوجاتی تو امت اسلامیہ ایک دم شریعت سے کنارہ کش، مذہب سے علیحدہ اور احکام مذہب سے بے پرواہ ہوجاتی۔

اموی سلطنت کا قیام و بقاء مذہب کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا اور احکام شریعت کو کمزور، بے وقعت، بے وقار نہیں بلکہ بالکل پیوند خاک اور ملیامیٹ کر دیتا۔

حسینؑ اپنی محدود دنیاوی زندگی کو اس مذہبی موت اور سچی فنا کے ساتھ کبھی گوارا نہ کر سکتے تھے۔

انہوں نے مسلمانوں کی نجات کا بیڑا اٹھایا۔ یعنی ان کے لئے نجات آخری کا راستہ صاف کرنے، حق وصداقت کی تعلیم دینے اور احکام مذہب سے صحیح طور پر روشناس کرنے کے لئے اپنی اور اپنے عزیزوں کی جان دینا گوارا کر لی۔

انہوں نے اس موقع پر اپنے عزیز ترین سرمایہ حیات کو بھی عزیز نہیں کیا۔ بھائی بھتیجوں اور دوسرے عزیزوں کے علاوہ اپنے جگر کے ٹکڑوں یعنی کم سن اور جوان فرزندوں کو بھی قربان کر دیا۔ اور چھ مہینہ کا ایک بچہ بھی جو تاریخ عالم میں اس کے پہلے اس طرح قربان نہ ہوا ہوگا، انہوں نے اسلام کی خاطر قربان کر دیا۔

آخر جس وقت کہ ان کے خزانہ میں کوئی موتی، سرمایہ حیات میں کوئی گوہر باقی نہ رہا، انہوں نے وہ آخری مرحلہ جو خاص ان کی ذات سے تعلق رکھتا تھا، اسے بہت استقلال کے ساتھ طے کر دیا اور بے حد وشمار زخم جسم پر اٹھا کے سر وگردن کے باہمی تعلق کو خیر باد کہا، خنجر شمر سے کچھ دیر کے راز ونیاز کے بعد جسم

ریگ صحرا پر اور سر نوک نیزہ پر خلق خدا کو ہدایت کا سامان کرتا نظر آیا۔ یہ تھے حسینؑ اور یہ تھی ان کی قربانی۔ یہ تھا واقعہ کربلا جس کی یادگار ہر سال محرم کے زمانہ میں قائم کی جاتی ہے۔

[ماخوذ از اخبار شیعہ لاہور محرم نمبر ۱۳۵۷ھ مطابق ۴/مارچ ۱۹۳۸ء ص ۱۶/۱۷/۱]

❁ ❁ ❁

(۲) شہید کربلا کا تدبر و استقلال

دنیا میں بہت سے ایسے واقعات پیش آیا کرتے ہیں۔ جنکی تہہ تک معمولی فکریں پہنچنے سے قاصر رہتی ہیں اور ظاہری نظریں ان کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اسباب وعلل یا آثار ونتائج کے متعلق بحث کا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے اور اقوال وآراء کے اختلاف وافتراق کی وجہ سے ایک ناواقف شخص سے حقیقت بالکل مخفی ہو جاتی ہے۔ لیکن اکثر اوقات اس کا باعث یہ ہوتا ہے کہ وہ واقعہ ایک مرتب نظام قدرت اور مسلسل واقعات وحالات کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جب تک ان مقدمات پر نظر نہ ڈالی جائے، کسی طرح اس آخری نتیجہ کے اسرار و وقائع پر روشنی نہیں پڑ سکتی۔ ایک زنجیر ہوتی ہے جس کی کڑیاں ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ کسی حصہ پر نظر ڈالتے وقت باقی کو نظرانداز کر دینا ناممکن ہوتا ہے اور وہ افکار وخیالات کا تصادم اکثر انہی مقدمات کے نظر سے اوجھل ہو جانے کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

امام حسینؑ کی شہادت اور اس کے اہم خصوصیات اگرچہ ایسے نہیں ہیں جو دنیا کی نظر سے مخفی ہوں اور ان پر کسی قسم کا پردہ پڑا ہوا ہو بلکہ ہر قوم وملت نے اس عظیم الشان واقعہ کے تاثیرات کو تسلیم کر لیا ہے۔ اور اس امر پر اتفاق سمجھنا چاہئے کہ حسینؑ نے اپنی شہادت سے اپنے مقصود کو حاصل ہی نہیں کر لیا بلکہ قیامت تک کے لئے اس میں روح پھونک دی۔ لیکن پھر بھی واقعات وحقائق کو تاریکی میں دیکھنے والے افراد حسینؑ کی شہادت پر طرح طرح کے اعتراضات کر کے اس کی اہمیت کو کم کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ سید الشہداؑ پر الزام دیا جاتا ہے کہ اپنی جان کو بے سمجھے بوجھے معرض ہلاکت میں ڈالا اور بے وجہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی خونریزی کے باعث ہوئے لیکن ہر وہ شخص جس نے اسلامی تاریخ کا کسی فرصت کے وقت مطالعہ کیا ہے، اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ یہ خیال ایک بڑی غلط فہمی یا کسی خلاف حقیقت مقصد کی تکمیل پر مبنی ہے۔ شام کے تخت پر بنی امیہ کا ظلم واستبداد پورے طور پر قدم جما چکا تھا۔ اور سابق کے متعدد تجربوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان کی آنکھ میں اہلبیت رسولؐ کا وجود خار کی طرح کھٹکتا ہے۔ اور وہ اس خانوادہ کے فنا کر دینے میں انسانی فرائض یا کسی عہد ومیثاق سے مرغوب نہیں ہیں۔ دوسری طرف اسلام کی روحانیت کو بالکل مٹا دیا جا رہا تھا۔ اور وہ دن دور نہ تھا کہ دنیا ایک مرتبہ اپنے ساتھ عقائد کی طرف الٹے پاؤں واپس پلٹ جائے اور عالم میں لات وعزیٰ کی پرستش کا دور دورہ ہو جائے۔ تیسری طرف رسولؐ کی یادگار امام حسینؑ کے لئے غیر جانبدار یا ساکت رہنا بھی ناممکن بنا دیا تھا۔ اور مدینہ کے گورنروں کو تابڑتوڑ خطوط لکھ کر اصرار بیعت پر اتنا آمادہ کر دیا گیا تھا کہ حسینؑ پر اپنے نانا کے مدینہ میں عرصۂ زندگی بھی تنگ ہو گیا تھا۔ موجودہ حالات میں امام حسینؑ یزید کی بیعت کر لیتے اور مدافعت کے لئے کھڑے نہ ہو جاتے تو یزید کے وہ اقوال وافعال جو اسلامی شریعت کو بیدردی سے پائمال کر رہے تھے اور ملت مصطفویہ کے نقش کو صفحہ وجود سے محو کر رہے تھے۔ فرزند رسولؐ کی سی محترم شخصیت کی اطاعت کے بعد حق بجانب قرار پاتے اور شام کا حاکم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔ اور اس کا باعث حسینؑ قرار پاتے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ امام بیعت سے کنارہ کشی کرتے ہوئے مدینہ ہی میں قیام رکھتے اور مدافعت کے خیال سے عراق کا رخ نہ کرتے۔ لیکن اس بات کی کون ذمہ داری لے سکتا ہے کہ اس صورت میں فرزند رسولؐ کے خون سے مدینہ ہی کی زمین رنگین نہ کر دی جاتی؟ اس بات کو جانے دو کہ مدینہ رسولؐ کی حرمت کو ضائع ہونے دینا حسینؑ کو گوارہ نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن سچ بتلاؤ کہ کیا

حسینؑ کی شہادت اس وقت وہ اہمیت پیدا کرسکتی تھی جو کربلا کی زمین پر اعزہ واقربا کی معیت میں شہادت سے پیدا ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں اگر حضرتؑ کو شہید کیا جاتا تو اس کو مختلف تاویلات کا جامہ پہنا کر بالکل مشتبہ صورت میں قرار دے دیا جاتا اور قطعاً وہ تبلیغ حقانیت جو موجودہ حالت میں ظہور پذیر ہوئی نہ ہوسکتی۔ اس کے علاوہ جو شخص بنی امیہ کے مقاصد وخیالات اور واقعات وحالات پر غور کرے وہ یقین کرسکتا ہے کہ بیعت کر لینے کی صورت میں بھی امام حسینؑ کی زندگی محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ بنی امیہ جو ہاشمی خاندان کے خون کے پیاسے اور اس کی مایہ ناز ہستیوں کے وجود کو دنیا میں نہ دیکھ سکتے تھے، یقیناً کسی نہ کسی بہانہ سے آپ کی زندگی کو معرض خطر میں ضرور ڈالتے۔ اور جب امام حسنؑ ایسا صلح کل اور خلق مجسم ان افراد کے ظلم وستم سے محفوظ نہ رہ سکا تو امام حسینؑ کے متعلق کون شخص اس بات کا ذمہدار ہوسکتا ہے کہ وہ مثل اپنے پیش رو امام حسنؑ کے کسی نا معلوم طریقہ پر شہید نہ کردیئے جاتے۔ اس وقت آپ کی جان بھی جاتی اور افراد بشر کے سامنے حقیقت کے واضح ہونے کا بھی کوئی طریقہ نہ تھا۔ بلکہ جس طرح اس سے پہلے امام حسنؑ کی شہادت سے انکار کیا جاتا رہا اسی طرح حضرت کی شہادت سے بھی برأت کرنا ضروری خیال کیا جاتا اور یہ یقینا یزید کی فتح اور حسینؑ کی شکست قرار پاسکتی تھی۔ کیونکہ اس حالت میں اول الذکر نے اپنے مقصد کو حاصل کیا، حسینؑ کے وجود کو دنیا سے محو کردیا اور پھر عالم کے سامنے اپنے تئیں بری بھی ثابت کردیا اور ثانی الذکر نے اپنی جان سے ہاتھ دھویا اور کوئی نتیجہ خیز اثر بھی دنیا میں نہ چھوڑا۔ بھلا حسینؑ سے محیر العقول تدبر واستقلال کی مالک ہستی سے کب توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس پہلو پر متوجہ نہ ہو۔ حسینؑ نے اپنا معاملہ دو مختلف صورتوں میں منحصر پایا۔ ایک یہ کہ خاموش طریقہ پر اپنی جان سے ہاتھ دھوئیں اور دین اسلام و شریعت نبویہ بھی یزید کے افعال و اقوال سے محو ہو کر رہے۔ دوسرے یہ کہ اپنی ہستی کو ظاہری صورت میں دست فنا کے سپرد کر کے ہمیشہ کے واسطے اپنی اور اپنے نانا کی تحریک کو زندہ کر کے اسلام کا ایک پائدار نقش چھوڑ دیں۔ فرزند رسولؐ نے اپنے عظیم تدبر و عاقبت اندیشی سے کام لے کر دوسری صورت کو ترجیح دی اور اسلام کو زندہ کرنے کے ساتھ اپنی موت کو اپنے اور اسلام دونوں کی فنا کے مقابلہ میں اختیار کیا۔ حسینؑ نے اپنی جان دے کر اپنے مخالفین کے مقاصد کو ہمیشہ کے لئے پائمال کردیا۔ اور یہی وہ عظیم فتح ہے جس کو حضرت نے ظاہری صورت میں فنا ہو کر حاصل کیا۔ بعض افراد جن کی عقل ان اسرار وحکم تک نہیں پہنچ سکتی ہے وہ حسینؑ سے خودکشی اور اپنے نفس کو تہلکے میں ڈالنے کے الزام کو یہ کہہ کر دفع کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ امام حسینؑ ابتدا سے آخر تک اپنی کامیابی کا یقین رکھتے تھے اور اہل کوفہ کے وعدوں پر بھروسا کر کے اس اقدام پر آمادہ ہوئے تھے، اور یہ کہ آپ کا قتل کچھ نامعلوم اور خلاف امید اسباب کے تحت میں ظہور پذیر ہوا، جن کی آپ کو پہلے سے خبر نہ تھی۔ یہ خیال اگرچہ ظاہری صورت میں مخالفین سید الشہداء کے اعتراض کا جواب لیکن حقیقتاً حضور کی ذات مقدسہ پر سوء تدبر اور ناعاقبت اندیشی کا الزام قائم کرنے کا ذریعہ اور واقعات حق سے کوسوں دور ہے۔ یہ مسئلہ تو اعتقادی ہے کہ امامؑ کو آئندہ ہونے والی اشیاء کا خدا کی طرف سے علم ہوتا ہے اور ان اخبار سے بھی ہم قطع نظر کرتے ہیں جن میں جناب رسالتمآبؐ نے موقع بہ موقع حسینؑ کی شہادت کے اہم واقعہ کے بہت پیشتر تمام مصائب کا تذکرہ کر کے عہد و میثاق لے لیا تھا۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک خود مستقل دلیل ہے کہ امام حسینؑ اپنی شہادت کے واقعہ کو بخوبی جانتے تھے۔ لیکن ہم کو ان میں سے کسی پہلو پر زور دیتے ہوئے اعتقادی رنگ چڑھ جانے کا خوف ہے جس کی وجہ سے شاید مخالف ماننے پر تیار نہ ہو۔ ہم صرف تاریخی اسناد سے اس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حسینؑ نے جو کچھ کیا ہے بے سمجھے بوجھے اور غفلت و بے خبری کی حالت میں نہیں کیا۔ بلکہ باوجود انجام سے واقف ہونے کے واقعہ کے پہلوؤں پر پورا غور کر کے اس عظیم اقدام کو عمل میں لائے۔ تاریخ

ان واقعات سے پُر ہے۔ اور حالات کا ایک طویل سلسلہ ہے جس سے یہ مطلب آفتاب کی طرح روشن ہوجاتا ہے۔ اور ہم نے اس وقت اسی ارادہ سے قلم اٹھایا ہے۔ کہ ایک اجمالی تبصرہ میں ان واقعات کا حوالہ دے دیں۔ کہ جن سے مطلب کی کافی طور سے وضاحت ہوتی ہے۔ اسے صرف واقعات کی فہرست سمجھنا چاہئے اگر ان میں ہر ایک واقعہ میں جو اسرار وحقائق مضمر ہیں، ان کی توضیح کی تو مضمون حد اعتدال سے خارج ہوجائے گا۔

(۱) ام سلمہ سے امام کی باتیں

مدینہ سے روانگی کے موقع پر ام سلمہؑ زوجہ رسولؐ آتی ہیں اور حسینؑ سے بہت منت کے ساتھ کہتی ہیں کہ فرزند مجھ کو اپنے سفر عراق کا صدمہ نہ پہنچاؤ، میں نے تمہارے ناناؐ سے سنا ہے کہ میرا فرزند حسینؑ زمین کربلا پر قتل کیا جائے گا۔ امامؑ فرماتے ہیں:۔

یا اما ہ وانا واللہ اعلم ذالك وانی مقتول لا محالة ولیس لی مہ ید وقد شاء اللہ ان یرانی مقتولا ویری حرمی مشر دین واطفالی مذبوحین۔

اے مادر محترمہ! میں خدا کی قسم اس بات سے بخوبی واقف ہوں، اور میں ضرور قتل کیا جاؤں گا، اور مجھ کو اس سے کوئی چارہ بھی نہیں ہے، اور خدا کی مشیت میں یہی گذرا ہے کہ میں قتل کیا جاؤں، اور میرے اہل حرم تتر بتر ہوجائیں، اور میرے کمسن بچے ذبح کرڈالے جائیں۔ (بحار الانوار وجلاء العیون وغیرہ)

حسینؑ نے ام سلمہؑ کے قول کو کسی تشویز اور اجنبیت سے نہیں سنا بلکہ پوری خاطر جمعی اور اطمینان سے بتلایا کہ میں خود اس سے خوب واقف ہوں اور تمام ہونے والے واقعات کی ایک اجمالی فہرست بیان فرمادی اور واقعات نے اس کو ثابت کر دکھایا۔

۲- بھائی سے امامؑ کا مکالمہ

عمر بن علی خدمت امامؑ میں آکر کہتے ہیں کہ مجھ کو بڑے بھائی حسنؑ مجتبیٰ نے والد ماجد کی زبانی خبر دی ہے۔۔۔ یہ کہتے کہتے آنسو جاری ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ آواز گریہ بلند ہوجاتی ہے۔ حسینؑ گلے لگا لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہی خبر دی ہے، نہ کہ میں قتل کیا جاؤں گا؟ آخر میں فرماتے ہیں کہ میں تمہارے پہلے واقف ہوں اور خوب جانتا ہوں۔

(لہوف سید ابن طاؤس)

۳- ابن عباس سے امامؑ کا ارشاد

عبداللہ ابن عباس اور ابن زبیر دونوں متفق ہوکر خدمت امامؑ میں سفر عراق سے روکنے کے لئے آئے۔ اس موقع پر حضرت نے فرمایا کہ **ان رسولؐ اللہ امرنی بامرو انا فاض فیہ**"۔ رسالتمآبؐ نے مجھ کو ایک حکم دے دیا ہے اور میں اس پر سختی سے قائم ہوں۔ ابن عباس مطلب کو سمجھ گئے اور وا حسیناہ کہتے ہوئے واپس ہوئے۔ (لہوف)

۴- شہادت کی صریحی پیشین گوئی

تاریخ طبری میں حضرت کا مکالمہ ابوہریرہ کے ساتھ درج ہے۔ اس میں حضرت نے فرمایا ہے:

وایم اللہ لتقلنی الفئة الباغیة۔ خدا کی قسم مجھ کو یہ باغی گروہ ضرور قتل کرے گا۔

۵- قصر بنی مقاتل کی روایت

تاریخ طبری وغیرہ تمام مستند کتابوں میں موجود ہے کہ جب حضرت قصر بنی مقاتل سے آگے روانہ ہونے لگے تو اس موقع پر آنکھ لگ گئی تھی۔ بیدار ہوئے تو دو تین مرتبہ **کلمہ انا للہ وانا الیہ راجعون** زبان مبارک پر جاری فرمایا۔ علی اکبرؑ نے بڑھ کر اس کا سبب پوچھا۔ حضرت نے فرمایا کہ ابھی میری آنکھ لگ گئی تھی۔ ایک سوار دکھائی دیا اور وہ کہہ رہا تھا کہ "**القوم یسیرون والمنایا تسیر الیھم**"۔ یقین ہے کہ یہ ہماری خبر موت دے رہا تھا۔ علی اکبر نے عرض کیا یا ابت لا اراك اللہ **سوئناء علی الحق** خدا حضور کو کوئی برائی نہ دکھلائے کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ حضرت نے فرمایا کیوں نہیں۔ علی اکبرؑ نے کہا پھر ہمیں موت کی کیا پرواہ ہے۔

۶- یحیٰ بن زکریا کی یاد

ارشاد شیخ مفید وغیرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسینؑ

جس منزل پر اترے یا وہاں سے روانہ ہوئے، یحیٰ بن زکریا کی شہادت کو ضرور یاد کیا اور فرماتے تھے کہ دنیا کی اس سے بڑھ کر ناقدری کیا ہوگی کہ یحیٰ بن زکریا کا سر بنی اسرائیل میں سے ایک زنا کار شخص کے پاس ہدیہ بھیجا جائے۔ سمجھنے والے سمجھتے تھے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

وہ حسینؑ کے خیر خواہ ظاہر دار احباب جو آپ کو سفر عراق سے روکتے تھے، وہ ان مقاصد سے بالکل بے خبر تھے جو آپ کی نظر میں موجود تھے اور جو تیزی کے ساتھ آپ کو کربلا کی زمین لئے جارہے تھے۔ محمد بن حنفیہ، عبداللہ بن عباس، عمر بن عبدالرحمن مخزومی، عبداللہ بن مطیع، فرزدق شاعر سبھی نے تو حضرت کو اس اقدام سے منع کیا۔ اگر یہ اقدام کسی کمزور توقع پر مبنی ہوتا، اتنے قوی اور بااثر موانع کے باوجود اس میں تغیر و تبدل پیدا ہوجاتا۔ مگر حسینؑ نے اس عزم و استقلال اور بصیرت کے ساتھ اس ارادہ کو قائم کیا تھا جس کو عالم کی تیز و تند آندھیاں متزلزل نہ کرسکتی تھیں، حسینؑ نے سب کو جواب دیا اور ساکت کردیا، جس میں پیشتر اپنے معاملہ کو مشیت خدا کے تحت میں بتلا کر ناقابل تبدل ظاہر کیا گیا تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو واقعی اسرار و رموز اس ارادہ میں مضمر تھے ان کا اظہار کسی وقت میں نہیں کیا گیا اور نہ ان کے اظہار کرنے کا موقع تھا، مشورہ دینے والے افراد کا نقطۂ نظر محدود تھا، ان کے کلام کا محور صرف چند چیزیں تھیں۔ آپ قتل کردیئے جائیں گے۔ اہل حرم اسیر کرلئے جائیں گے۔ اگر آپ قتل ہوگئے تو بنی ہاشم ذلیل ہوجائیں گے۔ عرب میں کسی کی عزت باقی نہ رہے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن امامؑ عالم تھے وہ ان تمام باتوں کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے اپنے ارادہ پر سختی سے قائم تھے۔ بھلا اگر حسینؑ کی شہادت کے قبل لوگوں سے کہا جاتا کہ اس شہادت سے اسلام کے قالب میں روح تازہ پھنک جائے گی اور عالم میں شریعت اسلامیہ کی حیات کے ساتھ حسینؑ بن علیؑ کا نام بھی جاودانی زندگی کا مالک ہوگا تو کوئی کاہے کو صحیح تسلیم کرتا۔ اسی لئے امامؑ نے ان افراد کو اصل مصالح اور اسرار سے مطلع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ حسینؑ اپنی شہادت میں کامیاب ہوئے اور ایسی فتح حاصل کی جو کسی ہفت اقلیم کے سلطان کو بھی نصیب نہیں ہوسکتی؟

[ماخوذ از شیعہ لاہور، محرم نمبر ۱۳۴۸ھ، ۱۶ تا ۱۸]

❁ ❁ ❁

(۳) حسینی یادگار کی شان

کربلا میں شہید ہوجانے والا رسولؐ کا فرزند بے شک اس کا مستحق تھا کہ رسولؐ کے نام لینے والے اور ان کا کلمہ پڑھنے والے اس کی یادگار کو ہمیشہ قائم رکھیں۔

افسوس ہے کہ اپنے تئیں مسلمان کہنے والوں کی اکثریت نے اس یادگار کی اہمیت کا خیال نہ کیا اور نہ اس کی ضرورت کا احساس کیا بلکہ ان میں کے متعصب اور تنگ نظر افراد نے اس کے مٹانے کو اکثر اوقات اپنا نصب العین رکھا۔ اور اس پر شرک و بدعت کے حربوں سے وار کرنا اپنا فرض سمجھے حالانکہ رسولؐ اسلام کا طرز عمل اور آپ کے اقوال و افعال نیز بعد کے حدیث و تاریخ کے مستند واقعات ایک مسلمان کے لئے اس یادگار کی صحیح اہمیت کا احساس کرنے کے لئے کافی ہیں۔ بہرحال باوجود ان مسلمانوں کی اس جدوجہد اور انتہا سے زیادہ سعی کے یہ خداوند عالم کا ارادۂ خاص اور مشیت مخصوصہ تھی کہ اس واقعہ کی یاد ہمیشہ اعلیٰ سے اعلیٰ پیمانہ پر زیادہ ہوتی رہی اور جیسا کہ بعض روایات کے مطابق حضرت معصومہ عالم سیدۂ نساء العالمین سے وعدہ ہوچکا تھا کہ ہمیشہ خدا ایک نہ ایک قوم کو مبعوث کرتا رہے گا، جو اس واقعہ پر ماتم کریں ویسا ہی ہوتا رہا اور ہر صدی اور صدی کے ہر جزو میں رسالت مآبؐ کے سچے جانثار ان کے پیارے نواسے کی یادگار قائم کرنے میں بیش از بیش انہماک سے مصروف رہے۔

بے شک دنیا کا کوئی گوشہ نہیں جہاں حسینؑ مظلوم کی عزاداری نہ ہوتی ہو اور ہر جگہ وہاں کے رسم و رواج کے طور طریقہ کے مطابق مراسم عزا ادا کئے جاتے ہیں اور پاک عقیدت مسلمان

اس میں شرکت کرتے ہیں۔ بیشک ہندوستان بھی اس میں کچھ پیچھے نہیں ہے اور یہاں خصوصیت سے ان شہروں میں کہ جہاں شیعوں کی آبادی کثرت سے ہے حضرت سید الشہدؑا کی عزاداری اس جوش وخروش، کوشش وانہماک کے ساتھ ہوتی ہے جو حقیقتہً قابل قدر درجہ رکھتی ہے۔

ہمارا لکھنؤ جو ایک طویل عرصہ تک شیعی دارالسلطنت رہ چکا ہے اور اس لئے شیعوں کی آبادی بھی یہاں اچھی خاصی ہے اور مرکزی حیثیت بھی اس کو حاصل ہے یہاں امام مظلوم کی یادگار جس اعلیٰ پیمانہ پر بھی نہ قائم کی جاتی ہو کم ہے۔

بے شک محرم کے زمانہ میں امیر سے امیر اور غریب سے غریب کوئی ایسا نہیں جو کچھ نہ کچھ حسینؑ مظلوم کے نام پر ایثار نہ کرتا ہو اور کم سے کم ایک چھوٹا سا تعزیہ ہی رکھ کر حسینؑ حسینؑ نہ کر لیتا ہو۔

عاشور، اربعین اور آٹھویں ربیع الاول کے دن خصوصیت سے تعزیہ اٹھتے اور سیکڑوں دو چار سے لے کر دس بیس اور پھر سو دو سو اور اس سے زیادہ کی تعداد کے ساتھ جلوس کربلا جاتے اور امام پر سینہ زنی کرتے ہیں۔ محلوں کی انجمنیں اور مختلف کمیٹیاں جو شہر کے اکثر گوشوں میں قائم ہیں وہ اپنے اپنے علم لے کر جاتی ہیں اور اس طرح بڑی رونق ہوتی ہے۔

یقینا دس بیس ہزار سے زیادہ کی تعداد ہوتی ہے جو عشرہ کے دن اور اربعین کو کربلا جاتی ہے اور سیکڑوں کی تعداد ان لوگوں کی ہے جو مختلف طرح سے ماتم کرتے ہیں اور ہزاروں روپیہ ہیں جو اس سلسلہ میں صرف ہوتے ہیں لیکن مجھے افسوس ہے کہ صرف بے ترتیبی اور انتشار کی وجہ سے اب تک کوئی ایسا اجتماعی مظاہرہ قائم نہیں ہوا ہے کہ جس کا اثر غیر اقوام پر پڑے اور انہیں حسینی واقعہ کی عظمت کا احساس ہو۔ بے شک ایسے ایک اجتماعی مظاہرہ کے لئے صرف تھوڑی سی توجہ کی ضرورت ہے۔ اور نہ کسی بڑی زحمت ومشقت کی ضرورت ہے، نہ مال ودولت کی۔

میری رائے یہ ہے کہ عاشورہ اور اربعین کے دن انجمنوں اور کمیٹیوں کے علیٰحدہ علیٰحدہ ماتمی جلوسوں کے لے جانے کے بجائے ایک عظیم الشان مشترک اور مخلوط متحدہ جلوس جانا چاہئے جس سے اتحاد قومی اجتماع ملی تنظیم واجتماعی کے بوقت واحد مظاہرہ کے ساتھ حسینی یادگار کی اہمیت قائم ہوتی ہے اور تمام موافق ومخالف جماعتوں کے دل پر اس کی ہیبت کا اثر پڑتا ہو۔

بے شک یہ ایک تجویز ہے اور مقام عمل میں آنے کے وقت اس میں بہت سے جزئیات قابل غور ہوں گے اور انہیں غور کرنے کے بعد طے کیا جا سکے گا۔

لیکن ابھی تک جو میری نظر میں اس کا خاکہ ہے یہ ہے کہ جس طرح کمیٹیاں اور انجمنیں اپنے اپنے علم براہ راست لے جاتی ہیں اس کے بجائے وسط شہر میں ایک جگہ جو اس کے لئے مناسب ہو اور وسعت بھی رکھتی ہو مقرر کی جائے۔ تمام کمیٹیاں اپنی اپنی جگہ سے اپنے انداز پر ماتم کرتی ہوئی اس مخصوص محل پر جو اجتماع کے لئے متعین ہے یکے بعد دیگرے متعینہ وقت تک پہنچ جائیں وہاں خواہ مختصر مجلس بھی ہو یا نہ ہو بہر حال جلوس کی ترتیب دی جائے اور تمام کمیٹیاں اور ماتمی دستے جو علیٰحدہ علیٰحدہ آتے تھے اس جلوس میں مجتمع طور سے شریک ہو جائیں۔ اس کی صورتیں دو نظر میں آئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر کمیٹی اپنے اجزاء ترکیبی اور افراد کی اجتماعی ساخت کے ساتھ قائم رہے اور کمیٹیوں کے جتھے سلسلہ کے ساتھ یکے بعد دیگرے ترتیب دیئے جائیں جس میں تقدیم وتاخیر کا سوال ایک تو اٹھایا ہی نہیں جانا چاہئے اس لئے کہ ماتم حضرت سید الشہدؑا کو ذاتی نام ونمود سے کیا تعلق ایک عزیز قریب کے جنازے میں شریک ہونے والے اور انتہائی درد والم سے مصروف نوحہ وشیون کرنے والے کیا کبھی اس کا خیال بھی کر سکتے ہیں کہ کون ہم میں آگے ہے اور کون پیچھے؟ پھر امام کے ماتم میں اس کا خیال کیا معنی؟

اور دوسرے اس کے لئے ایک اصول قرار داد کی جا سکتی ہے مثلاً یہ کہ انجمنوں کی ترتیب ان کے ناموں کے حروف کے اعتبار سے رکھی جائے یا اور کوئی ایسا ہی معیار جس کے بعد

شخصیتوں کا لحاظ نظر انداز ہوجائے اور شکایت کا محل پیدا نہ ہو۔
دوسرے یہ کہ مجمع بالکل مخلوط ومشترک ہو۔ تمام کمیٹیاں اس وقت تک حیثیت رکھتی ہوں جب تک کہ وہ اس محل اجتماع تک پہنچ گئی ہیں اور وہاں سے روانگی کے ہوتے ہوئے پھر وہ تمام مجمع ایک ہوجائے اور اس میں کوئی امتیاز نہ رہے۔ بے شک اس میں دشواری نوحہ خوانوں کی محسوس ہوتی ہے اس لئے کہ ہر کمیٹی کا ایک مخصوص نوحہ خوان ہوتا ہے اس کمیٹی کے ممبران اس نوحہ خوان کے ساتھ پڑھنے کی مشق رکھتے ہیں لیکن یہ اس وقت ہے کہ جب اس مخلوط مجمع کے ہونے کی صورت میں بھی بطور مرسوم نوحہ خوانی ضروری سمجھی جائے لیکن اگر ایسی صورت ہو کہ اس جلوس کے لئے مناسب موقع تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مناسب نعرے تجویز کئے جائیں جیسے "حسینؑ کشتہ شد" واحسین" یا متحدہ حیثیت سے ایک خاص قسم کا نوحہ مقرر کرلیا جائے جو تمام مجمع کے طول میں پڑھا جاتا ہو تو اس میں یہ دشواری باقی نہیں رہی اور اس میں جلوس کی شان وعظمت اور اس کے تبلیغی مفاد ونوعیت کو جس قدر میں محسوس کرر ہا ہوں اس کا اظہار قلم سے نہیں ہوسکتا۔
اس جلوس کے لئے کربلا پہنچنے تک راستہ میں مستقل توقف کی جگہ بھی پہلے سے مقرر کرلی جائیں اور ان کا اعلان کردیا جائے ان جگہوں پر ٹھہر کر دل کھول کر کے ماتم کیا جائے۔
اور ہر جگہ توقف کے وقت کو پہلے سے محدود ہونا چاہئے۔ اتنی دیر ماتم کے بعد جلوس آگے کو روانہ ہوا کرے اور پھر اسی صورت اجتماعی سے یہ سب کربلا پہنچیں۔
جلوس کے دوران میں پورے مجمع کو ایک نوعیت کا رہنا چاہئے۔ زنجیروں اور قمہ زن انجمنوں کو بھی جلوس کے اندر یعنی راستہ میں صرف ہاتھوں سے ماتم کرنا چاہئے اور مجمع کی یک رنگی کو صدمہ نہ پہنچانا چاہئے۔ کربلا پہنچ کر پھر تمام کمیٹیوں کو اختیار ہے کہ وہ علیحدہ علیحدہ ہوجائیں اور اپنے طریقہ سے ماتم کریں۔
میرے خیال میں اگر اس شان سے ماتمی جلوس کا انتظام ہوجائے تو شہادت امام حسینؑ کی بہت بڑی یادگار کہی جاسکے گی اور اس کے قواعد ملت ومذہب کے بہت بیش قرار ہوں گے۔
میں نہیں جانتا کہ بہت سے اہل الرائے حضرات میری اس رائے سے کہاں تک متفق ہوں گے۔ بہر حال میں نے ایک اپنا خیال تھا جو ظاہر کردیا۔ یا ایک خواب تھا جو بیان کیا اگر عمل ہوا تو اسے اس خواب کی تعبیر سمجھوں گا۔

[ماخوذ از ہفتہ وار سرفراز لکھنؤ، محرم نمبر ۱۳۵۴ھ]

❁❁❁

(۴) یاد اور یادگار

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمدؐ المصطفیٰ خاتم النبیین واٰلہ الطیبین الطاھرین المعصومین من یومنا ھذا الیٰ یوم الدین اما بعد فقد قال اللہ سبحانہ فی کتابہ المبین وھو اصدق الصادقین وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

[سورہ الذاریات آیت ۵۵]

ارشاد اقدس الٰہی ہے کہ یاددہانی کرتے رہئے۔ یہ یاددہانی اہل ایمان کے فائدہ کا باعث ہے۔
پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمہ متعدد فرائض تھے جو خالق کی جانب سے عائد کئے گئے تھے۔ ایک فریضہ ہے "تبلیغ" جس کے معنی ہیں پہنچانا جیسا کہ ارشاد ہوا، بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ سورہ مائدہ ۶۷" پہنچا دیجئے اسے جو آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔"
بلکہ عام طور سے بحیثیت رسالت ایک پیغمبر کا فریضہ یہی بتایا گیا ہے، مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ سورہ مائدہ ۹۹ یعنی رسول کا کام ہی بس پہنچانا ہوتا ہے۔
دوسرا فریضہ ہے۔ خبر دینا۔ نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔ سورہ حجر ۴۹" میرے بندوں کو خبر دیجئے کہ میں بڑا

بخشنے والا مہربان ہوں۔‘‘ بلکہ نبیّ کا لفظ ہی بعض علماء کے نزدیک نباء سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں خبر۔ اسی کے تحت بشارت ہے۔انذار ہے۔اسی وجہ سے آپ کے القاب ہیں بشیر ونذیر یعنی خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا۔ ان کے علاوہ ایک فریضہ تعلیم ہے۔ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔‘‘ وہ انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

مگر جس آیت کو میں نے سرنامۂ کلام قرار دیا ہے اس میں فریضہ کی نوعیت مختلف ہے مثلاً تبلیغ ’’پہنچانا‘‘ اس میں بہت ممکن ہے وہ بات پہلے پہل پہنچائی جارہی ہو۔خبر دینا بہت ممکن ہے اس کے پہلے وہ خبر نہ دی گئی ہو۔ بشارت پہلی دفعہ دی جارہی ہو۔ انذار پہلی مرتبہ ہورہا ہو۔تعلیم پہلی بار دی جارہی ہو،مگر یہاں کہا جارہا ہے یاددہانی کراتے رہئے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سبق دیئے جاچکے ہیں، خبریں پہنچائی جاچکی ہیں مگر منظور خالق یہ ہے کہ یہ نقش تازہ ہوتا رہے اور دماغ انسانی سے یہ یاد مٹنے نہ پائے۔

قرآن مجید نے یہ کہا کہ یاددہانی کراتے رہئے، مگر وہ کیا چیزیں ہیں جن کا یاد دلانا منظور خالق ہے، اسے قرآن مجید پیش نہیں کرتا۔ پھر اسے کیونکر سمجھیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے سمجھنے کا وہی ذریعہ ہے جو قرآن مجید کے ہر اجمال کی تفصیل سمجھنے کا طریقہ ہے۔

قرآن نے کہا ’’اقم الصلوٰۃ‘‘ نماز پڑھو، نماز کیونکر پڑھو؟ اس کا کوئی ذکر نہیں۔ دینیات کی پہلی کتاب جو بچوں کو پڑھائی جاتی ہے اس میں بھی ’’ترکیب نماز‘‘ درج ہوتی ہے لیکن قرآن مجید میں نہیں۔ وضو کی ترکیب ہے۔تیمم کی ترکیب ہے، مگر نماز کی ترکیب قرآن کریم میں شروع سے آخر تک کہیں نہیں۔

ہاں کسی جگہ ملے گا وارکعوا مع الراکعین، رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔‘‘ اب درج کرلیجئے فہرست میں رکوع، کہیں ہے لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ۔ سورہ رعد آیت ۱۰ ’’اللہ کی بارگاہ میں سجدہ کرتے ہیں سب جو آسمان اور زمین میں ہیں۔ اسے دیکھ کر لکھ لیجئے سجدہ۔ کہیں ہے ربّك فكبّر‘‘ اپنے پروردگار کی تکبیر کہو۔ درج کرلیجئے تکبیر‘‘ سبح بحمد ربك۔ اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو۔ اس سے تسبیح لکھئے اور اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ سورہ علق آیت ۱‘‘ اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ پڑھو‘‘ اب قرأت بھی لکھ لیجئے مگر قابل غور اصولی پہلو یہ ہے کہ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ یہ اجزائے نماز ہیں مگر قرآن میں یہ کہاں ہے کہ یہ اجزاء اس نماز کے ہیں جس کا اقم الصلوٰۃ میں حکم دیا گیا تھا۔ آخر اسی قرآن میں روزہ کا بھی تو حکم ہے۔ مگر وہ جزوِ نماز نہیں ہے۔ مستقل عبادت ہے، حج کا بھی حکم ہے مگر وہ جزو نماز نہیں ہے۔ اسی طرح ممکن تھا کہ رکوع مستقل عبادت ہو۔ سجدہ مستقل عبادت ہو، تسبیح مستقل عبادت ہو، تکبیر مستقل عبادت ہو۔ قرأت مستقل عبادت ہو، اور پھر صلوٰۃ کوئی اور چیز ہو۔ یہ کس نے بتایا کہ یہ سب نماز کے اجزاء ہیں۔

اچھا یہ اگر کسی طور سے سمجھ بھی لیجئے تو یہ سب تو مفردات ہیں مگر یہ نسخہ مرکب کیونکر ہو۔ اگر کوئی مسلمان سجدہ کرے اور پھر رکوع کرے پھر قیام کرلے پھر قرأت کرے۔ پھر تسبیح پڑھ لے اور پھر اللہ اکبر کہے تو قرآن کے بتائے ہوئے سب اجزاء عمل میں آگئے مگر کیا نماز ہوئی؟ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کو دیکھ کر نماز نہیں ہوئی ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل کو دیکھ کر نماز ہوئی ہے۔

اسی طرح قرآن میں زکوٰۃ کا حکم ہے مگر نصابِ زکوٰۃ، مقدار زکوٰۃ اور شرائط زکوٰۃ ان تمام مسائل کا کوئی ذکر نہیں۔

حج کو لیجئے لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ سورہ آل عمران آیت ۹۷ ’’لوگوں پر خانۂ کعبہ کا قصد لازم ہے‘‘ مگر قصد کرکے کیا کریں۔ مناسکِ حج کا بیان بالکل نہیں۔

اب ہر مسلمان کیلئے لمحۂ فکر یہ ہے۔ کیا متکلم قرآن معاذ اللہ نماز کا حکم دیتے ہوئے یہ بھول گیا کہ ترکیب نماز بھی بتانا ہے۔ زکوٰۃ کا حکم تو دے دیا، اور روا داری میں مقدار زکوٰۃ کا بیان رہ

گیا۔ حج کا حکم دے دیا اور سہواً مناسک حج کا بیان چھوٹ گیا۔

عام متکلم سے بھی یہ بھول ایک دو دفعہ ہوگی مگر ہر دفعہ بھول ہو۔ یہ خلاف تصور ہے۔ یہاں زکوٰۃ یا کسی دوسری ایک ہی چیز کی تفصیل رہ جاتی تو کوئی جاہل یا کافر سمجھ لیتا کہ یہ بھول کا نتیجہ ہے مگر صلوٰۃ میں بھی اجمالی حکم موجود اور تفصیل غائب۔ حج میں بھی حکم موجود مناسک حج ندارد۔ زکوٰۃ، خمس ہر جگہ یہی بات۔ تو اسے عام متکلم کے یہاں بھی سہو پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

پھر یہ متکلم تو انسانوں میں کا کوئی شخص نہیں ہے۔ باجماع امت قرآن کے اصل متکلم خود رسولؐ بھی نہیں ہیں کہ رسولؐ میں ایک ملتبۂ خیال بشریت کے لحاظ سے سہو کا تصور کر سکے۔ یہ متکلم تو خدا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کے یہاں بشریت کا کوئی جنبہ نہیں ہے لہٰذا کلام الٰہی میں کوئی اللہ کا بندہ سہو و نسیان کا قائل نہیں ہو سکتا۔

قرآن کی تصریح ہے۔ مَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا۔ سورہ مریم آیت ۶۴ ر" تمہارا پروردگار بھولنے والا نہیں ہے۔ پھر جب بھول کر تفصیلات ترک نہیں ہوئے ہیں تو اسے ارادی فعل ماننا پڑے گا اور اس بنا پر میں کہتا ہوں کہ قرآن نازل ہوا ہے اس صنعت میں کہ وہ کافی نہ ہو۔ اللہ چاہتا یہ تھا کہ رسولؐ سے دنیا بے نیاز نہ ہو جائے۔ اس نے قرآن میں ہمیں ہر ہر قدم پر رسولؐ کا محتاج بنا دیا ہے۔ قرآن کہہ رہا ہے۔ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ۔ مگر جب تک رسولؐ سے نہ پوچھو نماز پڑھ ہی نہیں سکتے۔ زکوٰۃ دے ہی نہیں سکتے۔ قرآن حج کا حکم دے رہا ہے مگر آپ "حاجی صاحب" بن ہی نہیں سکتے جب تک رسولؐ سے حج کے احکام معلوم نہ کریں۔ یعنی قرآن سہارا لے رہا ہے ناطق معلم کا اسی لئے جب معیار محبت الٰہی بتانا ہوا تو قرآن نے کہا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ۔ اگر اللہ سے محبت کرتے ہو تو رسولؐ کا اتباع کرو۔

کوئی سمجھ رہا تھا، محبت الٰہی کرنا ہو تو اللہ کے نام کی ضربیں لگائیں یاھو کے نعرے لگائیں تختے پر جسم کو معلق کریں میخوں پر۔ مگر قرآن نے یہ سب کچھ نہیں کہا۔ اس نے نام لیکر کوئی کام بتایا ہی نہیں۔ اس نے تو ایک فرد کے نقش قدم کو پیش کر دیا۔ اب اللہ سے محبت کرنا قیامت تک ہر مسلمان کو ہے جب تک خدا خدا ہے اور بندے بندے ہیں انھیں اس سے محبت کرنا ہے اور محبت کے لئے قرآن نے کچھ کاموں کی فہرست بتائی نہیں کہ اس فہرست کو حفظ کر لیں اور اللہ سے محبت ہو جائے۔ قرآن نے تو یہ کہا کہ اللہ سے محبت کرتے ہو تو ان کے نقش قدم پر چلو۔ اب اگر قرآن کی ہدایت سے اس نقش قدم پر نظر جمالی تو پھر چاہے اس آیت کو بھول بھی جائیں تب بھی وہ نقشِ قدم منزل تک پہونچا دے گا لیکن اگر وہ نقش قدم نظر سے اوجھل ہو گیا، تو قرآن کے ان الفاظ کا یاد کر لینا منزل تک کبھی نہیں پہنچا سکتا۔

معلوم ہوا کہ ہر منزلِ اجمال قرآن میں ہے اور منزلِ تفصیل عمل پیغمبرؐ میں ہے تو اسی طرح قرآن کا حکم ذکّر" یاد دہانی کرتے رہئے"، مجمل ہے۔

اس کی تفصیل سمجھنے کی صورت یہ ہے کہ عملِ پیغمبرؐ دیکھئے۔ جن چیزوں یا شخصیتوں کی یاد دہانی پیغمبرؐ کرتے رہے ہوں وہی مطلوب خالق ہے۔ اس کے علاوہ وہ نظامِ شریعت دیکھئے جسے پیغمبرؐ نے پہنچایا۔ اس میں جن یادوں کے قائم رکھنے کا انتظام کیا گیا ہو۔ انھیں مطلوب باری سمجھے۔ جب ہم اس طرح دیکھتے ہیں تو بلا شبہ اصل اصول تو اللہ کی یاد ہے۔ پیغمبرؐ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہی پیغام تھا کہ:

قُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا

کہو کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں تمہارا ہی فائدہ ہے۔

یہی قرآن کہہ رہا تھا کہ یاد دہانی کیجئے۔ اس یاد دہانی میں انہی کا فائدہ ہے اب قرآن اور ارشاد رسولؐ سے یہ اصول قائم ہو گیا کہ جن کی یاد دہانی ہو، اس سے فائدہ انہی کو پہنچے گا جو یاد قائم رکھیں گے۔ نہ کہ ان کو جن کی یاد ہو۔

چنانچہ اللہ کی یاد سے اللہ کا نہیں، بندوں کا فائدہ ہے۔ اور یہ وہ منزل ہے کہ کوئی اللہ کا ماننے والا یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اللہ کو فائدہ پہنچائے گا۔ وہ تو بے نیازِ مطلق ہے۔ اگر تمام دنیا سر

بسجود ہوجائے تو اس کے جاہ وجلال میں اضافہ نہیں اور اگر سب مل کر اس کے منکر ہوجائیں تو اس کے جلال و جبروت میں ذرہ بھر کمی نہیں۔ یوں تو اس زمانہ میں گویا ترقی پسندی کی علامت سمجھا جاتا ہے خدا کا انکار۔ یعنی دل ودماغ میں چاہے خدا ہو، مگر زبان پر نہ ہو۔ یہ جب کہنے لگتے ہیں کہ خدا کوئی چیز نہیں، تو سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم بڑے آدمی ہوگئے۔ یہ خدا کے منکر اور باغی ہیں، مگر یہ انکار زبان سے اس وقت تک ہے جب تک اس نے یہ زبان متحرک بنا رکھی ہے، اور آپ کے ارادہ کی تابع کر رکھی ہے۔ اس وقت تک چاہے اقرار کر لیجئے چاہے انکار۔ مگر وہ اس زبان کو خاموش کردے، تو کلام تو کر لیجئے۔ ہاتھ آپ کے قابو میں دے رکھے ہیں چاہے گرتوں کو سنبھالئے چاہے گھر جلایئے مگر وہ شل کردے تو ہاتھ کو حرکت تو دے لیجئے۔ پیر قابو میں دے رکھے ہیں۔ چاہے صحیح راستہ اختیار کیجئے یا غلط، لیکن اگر وہ مفلوج کردے تو جنبش تو کر لیجئے۔ اسلام کا مطالبہ صرف شرافت نفس کا مطالبہ ہے۔ یعنی جس کی اطاعت جبراً کرنا ہی ہے، اس کی اطاعت خوشی سے بھی کر لیجئے، ورنہ جس بات میں اطاعت اسے بہر صورت کرانا ہے، وہ تو کرا ہی لے گا۔ فرق یہ ہوگا کہ اس صورت میں ثواب کا حق نہ ہوگا۔

ہم نے سنا ہے کہ بعض ملکوں میں دعویٰ کیا گیا کہ ہم نے خدا کو اپنے یہاں سے نکال دیا، مگر کیا وہ نکل بھی گیا؟ کوئی حکومتِ الٰہیہ سے بغاوت کا کتنا ہی بڑا دعویدار ہو، میں تو جب جانوں کہ جب وہ بھیجے تو یہ نہ آئے، اور جب وہ بلائے تو یہ جائے نہیں، مگر صورت واقعہ تو یہ ہے کہ جب اس نے بھیجا تو یہ آئے، اور جب وہ بلائے گا، تو چپکے چلے جائیں گے، سانس بھی تو نہیں لیں گے۔ پھر ایسی بے نیاز مطلق جو ذات ہو، اس کو ہماری یاد سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

دوسری یاد رسولؐ کی یاد ہے۔ ہر مکتب خیال کے مسلمان کے نزدیک اذان میں شہادتِ رسالت ضروری ہے۔ پھر یہ کہ فقہ اسلامی کی کسی کتاب میں مؤذن کو ہدایت نہیں کہ شہادتِ توحید دو مرتبہ ہو لیکن شہادت رسالت ایک دفعہ ہوتا کہ خالق ومخلوق میں فرق ہوجائے۔ یا یہ کہ واجب نہ سہی، مستحب ہو، تاکہ شہادت توحید ذرا بلند آواز سے اور شہادت رسالت کو مدھم آواز سے کہے۔ ہرگز ایسی کوئی ہدایت نہیں بلکہ جس طرح شہادتِ توحید اسی طرح شہادت رسالت۔ یہ تو ہے اذان۔ اس کے بعد اقامت۔ یہ تو نماز کے ساتھ دست وگریبان ہے۔ فرادیٰ نماز میں بھی اقامت کہہ لی جاتی ہے کیوں کہ اس کا تاکیدی حکم ہے۔ اقامت میں بھی شہادتِ توحید کے ساتھ شہادت رسالت ضروری ہے۔ آپ اقامت ہی نہ کہئے، وہ اور بات ہے، لیکن اگر اقامت کہئے گا تو شہادتِ توحید کے ساتھ شہادتِ رسالت ادا کرنا ہوگی۔

اب خود نماز میں آیئے۔ ہر دوسری رکعت اور آخری رکعت میں جو نماز میں تشہد یا التحیات پڑھا جاتا ہے وہ کیا ہے؟

اَشْهَدُ اَن لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔

اب مسلمانوں کو غور کرنا ہے، نماز ایسی اہم عبادت جس میں خلوص نیت لازم، اس میں ذکر رسولؐ اور تصور رسولؐ۔ یہ منافی اخلاص تو نہیں ہے؟ شرک تو نہیں ہوگا؟ یاد رکھئے کہ شرک سے ہر مسلمان کو بچنا چاہئے اور نماز بھی ہر مسلمان کو پڑھنا ہے تو اب ہم سب ایک کشتی پر سوار ہیں۔ نماز کے اندر رسولؐ شریک ہوگئے ہیں۔ پھر بھی شرک نہیں ہے۔ اس کا راز ہر مسلمان کو سمجھنا اور سمجھانا ہے۔ اب جو حل میں پیش کروں یا تو اسے دنیا قبول کرے، اور دل چاہے تو شکر گزار رہو، کہ میں نے سب کا بار ہلکا کردیا، ورنہ خود کوئی حل پیش کرے، میں اس پر غور کرنے کے لئے تیار رہوں۔

میں کہتا ہوں کہ جو ذکرِ رسولؐ ہو رہا ہے۔ وہ کیا ہے؟ اگر یہ ذکر ہو کہ کسی بڑے باپ کے بیٹے ہیں تو یہ غیر اللہ کا ذکر ہوسکتا ہے۔ یہ ذکر ہو کہ خاندان بنی ہاشم کے چشم وچراغ ہیں تو یہ غیر اللہ کا ذکر ہوسکتا ہے، یہ ہو کہ وہ ملک عرب کے تاجدار ہیں، تو یہ غیر اللہ کا ذکر ہوسکتا ہے، لیکن یہ ذکر کہ محمدؐ خدا کے رسولؐ اور اس کے بندۂ خاص ہیں یہ تو عین ذکر خدا ہے۔ اس سے یہ اصول قائم

ہوتا ہے کہ جو ذکر رسولؐ کا مادی خصوصیات کے لحاظ سے ہو، وہ تو بس ذکر رسولؐ ہوسکتا ہے لیکن جو اللہ کے رشتے سے ہو وہ عین ذکر خدا ہے۔ بس اب یہ اصول محفوظ رکھنا چاہئے۔

رسولؐ کی تعظیم بھی اگر بڑے باپ کے بیٹے کی حیثیت سے ہو، بنی ہاشم کی ممتاز ترین فرد کی حیثیت سے ہو، ملک عرب کے تاجدار کی حیثیت سے ہو، تو وہ صرف رسولؐ کی تعظیم ہوگی، لیکن جو تعظیم اللہ کے رسولؐ کی حیثیت سے ہو، وہ اللہ کی تعظیم ہوگی۔ اب جو مسلمان روضۂ رسولؐ کو بوسہ دیتا ہے، اس سے پوچھئے کہ وہ کیا عرب کے تاجدار کی ضریح کو بوسہ دے رہا ہے، یا رسولؐ خدا کی ضریح کو؟ یہ بوسہ ضریح رسولؐ کا ہے، مگر عبادت اللہ کی ہے۔

بس اب اسی اصول کو گرہ میں باندھ لیجئے۔ کسی کی بھی تعظیم مادی خصوصیات کے لحاظ سے ہو، تو وہ اس شخص کی تعظیم ہوگی، لیکن اگر اللہ کی نسبت کے لحاظ سے ہو، تو وہ عین خدا کی تعظیم ہوگی، اور کسی طرح شرک قرار نہیں پاسکتی۔ لہٰذا کسی فدیۂ راہِ خدا کی تعظیم ہو، تو اسے بھی تعظیم خالق سے جدا نہیں سمجھنا چاہئے۔

بھلا اگر مادی خصوصیات کے لحاظ سے جھکنا ہوتا، تو دمشق بغداد اور قرطبہ کی بارگاہوں پر سجدہ ریزی نہ کرتے؟ ارے جو لٹی ہوئی بارگاہوں کو یاد کریں ان کے عمل میں للّٰہیت کے سوا اور جذبہ ہی کیا کارفرما ہوسکتا ہے؟ سوا خدا کے رشتہ کے کیا ہوسکتا ہے، جو محرک تعظیم ہو؟

اب یہ غور کرنا ہے کہ اذان میں ذکر رسولؐ داخل ہوا۔ اقامت میں داخل ہوا۔ نماز میں داخل ہوا۔ تو یہ سب کیا پیغمبرؐ نے خود کردیا؟ صرف اس لئے کہ میرا نام باقی رہے؟ اگر کسی نے یہ خیال کرلیا تو ایمان رسالت پر ختم ہوگیا۔ پھر قرآن میں دیکھئے ارشاد ہورہا ہے۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ ''ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کیا۔''

قرآن میں جب الوہیت اور خصوصیات الوہیت کا ذکر ہوتا ہے تو میں'' کہا جاتا ہے کہ غیر کے شرک کا شائبہ پیدا نہ ہو۔ انی انا ربکم۔ ''میں تمہارا پروردگار ہوں'' مگر جہاں زور عمل دکھانا ہوتا ہے وہاں ہم کہا جاتا ہے۔ جہاں یہ لفظ ہو وہاں امکانی طاقتوں کو ایک چیلنج ہوتا ہے جیسے اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ، سورۂ کوثر آیت ۱ر ''ہم نے آپ کو کثرت نسل عطا کی اب اسے مٹا کون سکتا ہے'' اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ سورہ حجر آیت ۹ر ''ہم نے قرآن اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں'' یعنی اسے ختم کون کرسکتا ہے۔ اسی طرح ارشاد ہورہا ہے **ورفعنا لك ذكرك** ''ہم نے آپ کے ذکر کو اونچا کیا ہے یعنی اب اسے نیچا کون کرسکتا؟

معلوم ہوا کہ یہ رسولؐ کا انتظام نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف کا انتظام ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

قرآن مجید میں ہے فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ۔ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ یعنی صلہ از جنس عمل ہوتا ہے ہم یاد کریں گے اسے اپنے امکان کی عاجزی کے ساتھ۔ وہ ہمیں یاد کرے گا اپنے وجوب کی توانائی کے ساتھ۔ اب یاد کرنا تو ہے محدود چیز لیکن جو اس کے ذکر کو قائم کرے وہ اس کے لئے کیا کرے گا۔ یہی کہ وہ اس کے ذکر کو ہمیشہ کیلئے قائم کردے۔

یہاں تک ذکر خدا اور رسولؐ کی منزل طے ہوئی۔ اب کوئی اور چیز ہے جس کا ذکر پیغمبرؐ خدا وقتاً فوقتاً کرتے رہے ہوں۔ یہ کوئی اور چاہے شخصیتیں ہوں، چاہے واقعات۔ تلاش سے ہمیں سیرت رسولؐ میں ہستیاں اور واقعات دونوں ہی مل جاتے ہیں۔ ''جن کا وقتاً فوقتاً ذکر سیرت وسنت رسولؐ رہا۔

یہ ہستیاں اہل بیت رسولؐ کی ہیں۔ یہ رسولؐ کے خاص قرابت دار ہیں، یعنی ایک رسولؐ کی بیٹی ہے جس کا تذکرہ بار بار فرمارہے ہیں۔ ایک داماد ہے، جو داماد ہونے سے پہلے آپ کا بھائی بھی تھا اور دو نواسے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کا ذکر بار بار فرمارہے ہیں۔

اب ایک مکتبۂ خیال ہے جس کے دماغ میں یہ خلش ہے کہ بیٹی اور داماد اور نواسوں کا ذکر بار بار کیوں؟ میں اس منزل پر ہر صاحب عقل کو مخاطب کرتا ہوں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ داماد،

نواسے آل اولاد سب کی منزل اپنی ذات کے بعد ہے۔ اصل محبت ذات سے ہوتی ہے اور وہی بیٹی داماد اور نواسوں سے محبت کا سبب ہوتی ہے۔

اب ایک مسلمان وہاں سے گذر گیا، جہاں اپنا نام اذان، اقامت اور نماز میں رکھا جارہا تھا۔ وہاں یہ نہ سوچا کہ انھوں نے اپنے نام کی خاطر شریعت کے احکام بنادیئے ہیں، تو اب اہلبیتؑ تک پہونچ کر کیوں اپنے ایمان کو خطرہ میں ڈال رہا ہے۔

اگر اپنے نام کا رکھنا فریضۂ الٰہی کے احساس سے ہے، تو اہلبیتؑ کا بار بار ذکر کرنا بھی اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ نہ وہ اس لئے تھا کہ میرا نام رہے، نہ یہ اس لئے ہے کہ یہ میرے بیٹی اور داماد ہیں بلکہ ان کے نام کی بقاء سے اسلام باقی ہے اور یہ ان کے اہل بیتؑ بھی کچھ ایسے ہی ہیں کہ ان کے ذکر کے قیام سے مقاصدِ الٰہیہ کا قیام ہے۔

نہ اللہ کی یاد اللہ کے فائدہ کے لئے تھی۔ نہ رسولؐ کی رسولؐ کے فائدہ کے لئے، اور نہ ان کے اہل بیتؑ کی یاد ان اہل بیتؑ کے فائدہ کے لئے ہے، بلکہ یہ سب خلق خدا کے فائدہ کے لئے تھا۔

اب سوچئے سمجھئے کہ اہل بیتؑ کی یاد سے خلق خدا کا کیا فائدہ ہے؟

کہا جاتا ہے کہ اتنے فضائل ان حضرات کے بیان کئے جاتے ہیں جیسے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ کا کوئی اور کام ہی نہ تھا، سوا اپنی بیٹی، داماد اور نواسوں کے فضائل بیان کرنے کے۔ اسے ایسے انداز میں کہا جاتا ہے کہ سننے والا جیسے شرما جاتا ہے، مگر میں تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہوں گا کہ یہ سوال ایسا ہے جیسے کوئی کہے کہ یہ رسولؐ کیسے ہیں کہ بس ہر وقت قرآن ہی پڑھا کرتے ہیں۔ انھیں کچھ اور آتا ہی نہیں۔ کیا یہ سوال کوئی معقولیت رکھتا ہے؟

حضور والا! یہ اسی قرآن کی تعلیم کے لئے آئے ہیں، تو قرآن نہیں تو کیا توریت، انجیل اور زبور پڑھیں۔ جس کتاب کی تبلیغ کے لئے آئے ہیں اسی کو پڑھتے ہیں۔ بس اسی طرح جب قرآن کی تعلیم دیتے ہیں تو جو اس کے سب سے حسین مرقعے ہیں، انہی کو سامنے لاتے ہیں۔

جدید طریقۂ تعلیم یہ ہے کہ براہ راست تعلیم نہ ہو بالواسطہ تعلیم ہو یعنی حروف یاد نہ کرایئے۔ بچہ سمجھے گا تصویریں دیکھ رہا ہوں اسی ذیل میں اس کو وہ حروف یاد ہو جائیں گے۔ دنیا اس رازِ تعلیم کو آج سمجھی ہے، مگر خدا اور رسولؐ اس راز سے پہلے ہی واقف تھے۔ قرآن پڑھنا جو تھا وہ براہ راست تعلیم تھی، اور اہل بیتؑ کو دکھانا بالواسطہ تعلیم تھی۔

جس طرح اس وقت تعلیم دو طرح ہو رہی تھی، وہی صورت آج بھی ہے۔ ہماری مجلسیں بھی مدرسوں کی طرح تعلیم گاہ ہی ہیں، مگر مدرسے ہیں براہ راست تعلیم کا مرکز، اور مجلسیں ہیں بالواسطہ تعلیم کا مرکز۔ یہاں رونے آتے ہیں اور کتنے سبق پڑھ کر چلے جاتے ہیں۔ حقائق ان کے کتنے درس سننے والوں تک پہونچ جاتے ہیں۔ تذکرۂ حسینی کے ساتھ تمام انبیاء ومرسلینؑ کے واقعات یاد ہوتے ہیں، اور توحید سے لے کر معاد تک تمام اصول دین بہ دلائل گوش گزار ہوتے ہیں۔ حسینؑ کی یاد میں مضمر ہے، ان کے پیش رو تمام حامیان حق کی یاد۔ اور کیوں نہ ہو۔ ان کی قربانی میں سب کی قربانی مضمر ہے۔

قرآن مجید نے ایک مقام پر ایک چیز کا نام لیکر کہا ہے کہ اس کی یاد تازہ کرو۔ وہ کیا ہے؟

ذکّرهم بایام الله۔ یعنی اللہ کے دنوں کی یاد تازہ کرو۔ اللہ کے دن کون ہیں؟ وہ جن میں کوئی معرکۂ حق و باطل ہوا ہو۔ جس دن اس کی راہ میں کوئی کارنامہ ہوا ہو۔ اس سے ثابت ہے کہ ایسے کسی دن کی یاد قائم کرنا بدعت نہ ہوگی۔

دن یاد دلایا جارہا ہے تو تاریخ کے تعین کے ساتھ یادگار قائم کرنا قطعاً بدعت نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ قربانی اسماعیلؑ کی یاد دن کے تعین کے ساتھ ہی قائم ہے، اور بلا تفریق فرقہ اجماع امت ہے کہ یہ یاد قائم رکھی گئی ہے۔ عیدالاضحیٰ کے نام سے۔ یہ یاد ہے قربانی اسمٰعیلؑ کی۔

اب مسلمان غور کریں کہ کسی دن جمع ہو کر تذکرۂ اسماعیلؑ ہو جایا کرتا، مگر وہی سا دن مقرر کر دیا جس دن قربانی ہوئی تھی۔ ۱۰

ذی الحجہ اورصرف روز قربانی ہی نہیں، بلکہ اس کے پہلے ایک دن روز عرفہ کو بھی یاد رکھا گیا، اور اس کے پہلے روزِ ترویہ بھی یاد رکھا گیا۔ اس عشرہ کو ذی الحج کے تمام وکمال اہمیت ہوگئی کہ حج کا احرام اسی میں بندھتا ہے۔

پھر اسمٰعیلؑ کی خاطر عشرۂ ذی الحجہ یادگار بن گیا، تو حسینؑ کی خاطر عشرۂ محرم کیوں نہ یادگار رہے۔ یہ قربانی خاص دسویں محرم کو ہوئی مگر عشرہ کا جو دن ہے وہ اس قربانی کے سفر کی ایک منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔

جب حسینؑ کربلا پہونچے تو نام پوچھا۔ جب کسی نے کہہ دیا ''کربلا'' تو مولاؑ نے فرمایا۔ **ھٰھنا واللہ مناخ رکابنا** " یہاں بخدا ہمارے خیمے نصب ہوں گے۔'' یہ آج کی تاریخ کا حال ہے۔ پھر **وسفك دمائنا** " یہیں ہمارے خون بہائے جائیں گے۔ یہ دسویں کی عصر تک حال ہو گیا۔ اس کے بعد **وھتك حریمنا** ۔ یہیں ہماری ہتک عزت ہوگی۔ یہ عصر عاشور کے بعد سے رہائی اہل حرمؑ تک کی مدت کا پورا حال ہے۔

وہ قربانی اسمٰعیلؑ کی یاد تھی اور یہ حسینؑ کی قربانی کی یاد ہے۔ قربانئ اسماعیلؑ کا عشرہ قربانی تک ختم ہو گیا لیکن قربانی حسینؑ کا ایک عشرہ قربانی تک ہے۔ یہ بھائی کا عشرہ ہے اور دوسرا عشرہ قربانی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یہ بہن کا عشرہ ہے۔ وہ عشرہ دس دن کا تھا مگر اس دوسرے عشرہ کی تعداد کا تعین نہیں ہوسکتا۔ جبکہ رہائی دوسرے سال ہوئی ہو۔ تو اب سال کا ہر دن زینبؑ کا ہو گیا۔ وہ قربانی حسینؑ تھی اور یہ قربانی زینبؑ۔

اب مسلمان انصاف کریں، کہ خلیلؑ کا فرزند قربان ہو، تو یاد قائم کی جائے۔ اور حبیبؐ خدا کا فرزند قربان ہو تو یاد کرنا بدعت ہو؟ حالانکہ خلیل اللہ سے ہمارا رشتہ اعتقادی ہے، عملی نہیں ۔ تو گذشتہ دور کے رسولؑ کے کارنامہ کی یاد قائم رکھے جانے کے قابل ہو، اور اپنے رسولؐ کے کارنامہ کی یاد قائم نہ رکھی جائے؟

اب کہا جاتا ہے کہ یاد بطور غم کیوں منائی جائے۔ یوم مسرت منایا جائے۔ یہ بہت سمجھ بوجھ کر بات کہی جارہی ہے۔ یاد رہے کہ مسرت میں صلاحیت بقا نہیں۔ جو غم میں جاذبیت ہے، وہ مسرت میں نہیں۔ جب خوشی منائی جائے تو وہ خوشی ہماری ہی رہے گی، لیکن جب غم ہوتا ہے تو دنیا اس میں شریک ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ یاد حسینؑ کو غیر فطری بنادیں لیکن ہم اس فریب میں آنے والے نہیں۔

منطق کا جواب منطق ہی سے دیا جاسکتا ہے۔ حسینؑ کی یاد خوشی کی صورت میں اس وقت منائی جاتی کہ جب قربانی اسمٰعیلؑ کی یاد بطور غم ہوتی۔

پھر سنئے اور یاد رکھئے کہ اگر قربانی اسمٰعیلؑ کی یاد بطور غم ہوتی، تو قربانی حسینؑ کی یاد بطور خوشی ہوتی، مگر وہ عید ہے۔ عید کا ہے کی ہے؟ یہی تو کہ نبی زادہ بچ گیا، تو اب محرم میں ماتم کیجئے۔ غم منایئے کہ رسولؐ زادہؑ مار ڈالا گیا۔ اور پیغمبرؐ کا باغ تاراج ہو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ فرزند رسولؐ درجۂ رفیعہ شہادت پر فائز ہوئے، تو اس پر خوش ہونا چاہئے مگر اس درجۂ رفیعہ کے تقاضوں کو یہ لوگ زیادہ جانتے ہیں، یا حضرت پیغمبرؐ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟ تو پھر دیکھئے کہ رسول خداؐ روز عاشورہ خوش ومسرور نظر آئے یا مغموم وگریاں؟

صحاح ستہ میں سے صحیح ترمذی ملاحظہ ہو:۔

عصر عاشورام سلمہؓ نے رسولؐ اللہ کو سر برہنہ دیکھا اس طرح کہ سر وریش مبارک پر مٹی پڑی ہے۔ ہاتھ میں ایک شیشہ ہے جس میں خون تازہ جوش مار رہا ہے۔ فرمایا میرا فرزند حسینؑ شہید کر دیا گیا۔ یہ میرے سر وریش پر خاک کربلا اور شیشہ میں حسینؑ اور انصارِ حسینؑ کا خون ہے جسے میں جمع کرتا رہا ہوں۔

رسولؐ اپنے حسینؑ پر رو رہے ہیں تو حسینؑ علی اکبرؑ کی لاش پر رو رہے ہیں۔ اب کوئی نہ کہے کہ یہ شان حسینؑ کے خلاف ہے۔ رسولؐ زندگی میں بھی روئے اور بعد میں بھی روئے اسی طرح حسینؑ بھی رو رہے ہیں۔ یہ خلاف صبر نہیں ہے۔ صبر تو یہ ہے کہ جو جوان کو رو چکا، وہ چھ مہینے کے بچہ کو بھی ہاتھوں پر قربان کرنے کے لئے لاتا ہے۔

کبھی کہا جاتا ہے کہ کہاں تک روؤ گے؟ بس رو چکے اتنے دن کہیں رویا جاتا ہے! میں کہتا ہوں یہ تو قدرت کا انتظام ہے اسباب ظاہری کے لحاظ سے اگر انھیں رو لینے دیا ہوتا جنھیں رونے کا حق تھا تو شاید رونا اتنا دیر پا نہ ہوتا۔

حسینؑ کو رونے والوں کی کمی نہ تھی۔ زینبؑ وام کلثومؑ ایسی بہنیں لیلیٰ و ربابؑ ایسی بی بیاں۔ سکینہ وفاطمہؑ ایسی بیٹیاں، مگر انھیں رونے ہی کب دیا گیا۔ ادھر شہادت کی خبر آئی ادھر دشمن آگ لیکر آ گئے۔ اب پردہ کے لئے جہاد کریں کہ روئیں۔ اور پھر گیارہویں کو شہزادیاں قید تھیں اور راہ کوفہ وشام میں اگر کسی کی آنکھ میں اشک آ تا تو اشقیاء نوک نیزہ سے اذیت دیتے تھے۔

اللہ نے ان کے ضبط وسکون کا بدلا ان کو دیا کہ تمہاری نیابت میں آسمان وزمین روئیں گے جو آج حسینؑ کا ماتم کر رہے ہیں، وہ سب زینبؑ کی نیابت کر رہے ہیں۔

زینبؑ بھی رونے ہی کی پیاسی تھیں۔ حالانکہ جب سے ساتویں محرم کو کربلا میں پانی بند ہوا تھا، پھر آج تک اتنا پانی نہ ملا تھا کہ جو سیراب کرتا، مگر پیاس تھی تو آنسوؤں کی۔ چنانچہ جب حکم رہائی ملا۔ یزید نے کہا خواہ یہاں رہئے یا مدینہ جایئے آپ کو اختیار ہے۔ یہ خاندان رسالت کا حفظ مراتب تھا کہ سید سجادؑ کہتے ہیں کہ بغیر پھوپھی سے پوچھے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

شاید یہ پہلا موقع تھا کہ یزید نے سید سجادؑ کو بلایا تھا، اور زینبؑ ساتھ نہ تھیں۔ معلوم نہیں اتنی دیر میں زینبؑ پر کیا گذری۔ غالباً بھتیجے نے پھوپھی کو دروازہ پر پایا ہو۔ جونہی بھتیجا آیا۔ سر سے پیر تک دیکھا ہوگا فرق تو محسوس ہی کر لیا۔ آئے ہیں تو ہتھکڑیاں بیڑیاں کاٹی جا چکی ہیں، طوق الگ کیا جا چکا ہے۔

پوچھنے پر بتایا کہ یزید نے رہا کر دیا ہے، اور کہا ہے کہ چاہے یہاں رہیں چاہے مدینہ جائیں۔ جناب زینبؑ نے فرمایا پھر تم نے کیا کہا۔ عرض کیا آپ سے بغیر پوچھے میں کیا کہہ سکتا تھا۔

یہ جناب امیرؑ کی بیٹی ہے جو سیاست شاہانہ کو شکست دے رہی ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ سیاستِ وقت کا دباؤ ہے جو مجبور کر رہا ہے، ہم مظلوموں کی دل جوئی پر۔ فرمایا یزید سے میری طرف سے کہو کہ ابھی تو ہم اپنے وارثوں کو روئے نہیں ہیں پہلے ایک مکان خالی کرادے کہ ہم اپنے عزیزوں کو رو لیں۔ پھر بتائیں گے کہ اب ہم یہاں رہیں گے، یا مدینہ واپس جائیں گے۔

لیجئے حسینؑ کے ماتم کی صف بچھ گئی۔ اب جو پتہ چلا کہ حسینؑ کا ماتم ان کے ورثا کر رہے ہیں، تو سوگواروں کا لباس پہن کر شرفائے قریش کی عورتیں آئیں۔ یقینا حضرت زینبؑ نے اس صف ماتم کے ساتھ ہزاروں دلوں میں حضرت امام حسینؑ کی صفِ ماتم بچھادی۔ ہم سب بھی آج زینبؑ کی بچھائی ہوئی صف پر ہیں۔

اب کون بتا سکتا ہے اس اثر کو کہ لیلیٰ کی زبان اور علی اکبرؑ کا ماتم۔ بیوہ حسن کی زبان اور قاسمؑ کا بیان۔ زینبؑ کی زبان اور حسینؑ کا مرثیہ۔ ربابؑ کی زبان اور علی اصغرؑ کا نوحہ۔

اور پھر تو حضرت زینبؑ نے انتہا کردی۔ آپ سب کو اندازہ ہے کہ آخری مجلس میں ذاکر کے بیان کے بعد جب شبیہیں آ جاتی ہیں تو کیا اثر ہوتا ہے۔ حالانکہ ان شبیہوں میں کیا ہوتا ہے؟ ایک تابوت جس میں لاش کوئی نہیں۔ ایک گہوارہ جس میں بچہ کوئی موجود نہیں۔ ایک ذوالجناح جس پر سوار کوئی نہیں۔ اس سے کیا کہرام برپا ہوتا ہے۔

اور وہاں جناب زینبؑ فرماتی ہیں کہ یزید سے کہو کہ جہاں اتنا کیا ہے ہمارے عزیزوں کے سر بھی بھیج دے۔ لیجئے ماتمی صف بستہ کھڑے ہیں اور اٹھارہ سر لائے جاتے ہیں **واحسیناہ واعباساہ واعلی اکبراہ۔**

[سلسلہ اشاعت امامیہ مشن لکھنؤ نمبر ۷۹۴، محرم ۱۳۸۶ھ]

❀❀❀

(۵) سوال وجواب بسلسلۂ ’’یادو یادگار‘‘

(سوال سید سرفراز حسین صاحب، اچھرہ، لاہور)

جناب کا ایک مقالہ بعنوان ’’یادو یادگار‘‘ شیعہ، لاہور۔ محرم نمبر ۱۳۶۶ھ میں شائع ہوا ہے۔ میں نے اس کا بغور مطالعہ کیا

ہے۔اس میں طریق استدلال نہایت موثر اور منطقیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے جس نے بے حد متاثر کیا۔ ممکن ہے کہ میں ایڈیٹر ہفتہ وار اخبار ’شیعہ‘ سے درخواست کروں کہ اس مقالہ کی بہت سی کاپیاں چھپوا کر ہر طبقہ خیال کے مسلمانوں میں مفت تقسیم کرنی چاہئے۔

ایک دو باتیں بہرحال مجھے اس میں کھٹکتی ہیں جن کی وضاحت کے لئے میں یہ خط آپ کی خدمت میں لکھ رہا ہوں۔ آپ کا مضمون مندرجہ بالا پرچہ ’شیعہ‘ میں صفحہ ۳۵ر لغایت ۴۲ر شائع ہوا ہے۔

۴۱ر پر جو کچھ شائع ہوا ہے اس کا اقتباس پیش کرتا ہوں:

’’یعنی اللہ کے دنوں کو یاد کرو‘ ‘ اللہ کے دن کون ہیں؟ وہ جن میں کوئی معرکۂ حق و باطل ہوا ہو، جس دن اس کی راہ میں کوئی کارنامہ ہوا ہو۔ اس سے ثابت ہے کہ ایسے دن کی یاد قائم کرنا بدعت نہیں ہوگی۔

دن یاد دلایا جا رہا ہے تو تاریخ کے تعین کے ساتھ یادگار قائم کرنا قطعاً بدعت نہیں ہوسکتا، چنانچہ قربانی اسماعیلؑ کی یاد دن کے تعین کے ساتھ ہی قائم ہے اور بلاتفریق اجماع امت ہے کہ یہ قائم رکھی گئی ہے عیدالاضحیٰ کے نام سے۔ یہ یاد ہے قربانی اسمٰعیلؑ کی۔ پھر اسماعیلؑ کی خاطر عشرۂ مبشرہ ذی الحجہ یادگار بن گیا تو حسینؑ کی خاطر عشرۂ محرم کیوں نہ یادگار رہے۔

میں امام حسینؑ کی یادگار قائم رکھنے کا قائل ہوں اور اسے بعض لحاظ سے ضروری بھی سمجھتا ہوں، مگر میرا استدلال اور وجوہ کی بنا پر ہے جو میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ آپ کے استدلال میں مجھے اس جگہ تھوڑا سا منطقی سقم نظر آتا ہے جس کی علم منطق میں ایک خاص انگریزی اصطلاح ہے جو مجھے اس وقت یاد نہیں آرہی ہے مگر جو اس قسم کے دلائل پر منطبق ہوتی ہے جیسا کہ آپ نے دیئے ہیں۔

حضرت اسماعیلؑ کا واقعہ اور ان کی جگہ جو قربانی دی گئی اس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اور خود رسولؐ اللہ نے اپنی زندگی میں اس یادگار کو قائم کردیا جس کی وجہ سے یہ یادگار قائم ہے۔ برخلاف اس کے امام حسینؑ کی قربانی کا ذکر کنایتہً بھی قرآن میں نہیں ہے۔

اگر یہ استدلال کیا جائے کہ جب قرآن نازل ہوا تھا تو اس وقت یہ واقعہ پیش نہیں آیا تھا تو ایسی تو کسی آیت کی ممانعت نہیں ہو سکتی تھی کہ کسی شہید راہِ خدا کے لئے جس کے کارنامے خصوصی اہمیت کے حامل ہوں کوئی یادگار قائم کر لینا باعثِ ثواب ہوگا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، قرآن مجید میں اس نوع کی کوئی آیت نہیں ہے۔

عملاً ہم دیکھتے ہیں کہ رسولؐ اللہ نے حضرت حمزؓہ کے شہید ہونے کے بعد کوئی سالانہ یادگار قائم نہیں کی ہے حالانکہ وہ بھی اپنے وقت میں سیدالشہدؑاء کہلائے۔ رسولؐ اللہ صلعم اس شہادت پر ضرور روئے ہیں بلکہ اوروں کو بھی رونے کے واسطے کہا ہے، مگر یہ سب کچھ مقتضائے بشریت ہے اور میت کو سامنے دیکھ کر سوائے سنگ دل کے کسے رونا نہیں آئے گا؟ مگر انہوں نے اس کی کوئی سالانہ یادگار بصورت برسی وغیرہ قائم نہیں کی۔ اسی طرح شہادتِ امام حسینؑ کے وقت اگرچہ رسول صلعم اور حضرت علیؑ موجود نہ تھے مگر ان کے بعد آٹھ ائمہ معصوؑم تو گذرے ہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے انہوں نے بروز عاشورا یعنی شہادت کے دن کی یاد کسی ایک ایسے طریق پر نہیں کی جیسے کہ اب کی جاتی ہے۔ اگر وہ باہر بازار یا گلیوں میں بوجہ ناموافق حکومت، ایسا نہیں کر سکتے تھے تو اپنے گھر میں تو کر سکتے تھے۔ یا کم از کم کوئی اقوال ان کی جانب منسوب ہوتے کہ ذوالجناح یا تعزیہ یا علم وغیرہ کا نکالنا باعث ثواب ہے۔

گریہ انہوں نے ضرور کیا ہے اور رسولؐ اللہ نے بھی بروزِ عاشورہ گریہ کیا ہے اور یہ بالکل ایک فطری چیز ہے کہ ایسے المناک حادثہ پر کون اپنے آنسو ضبط کر سکتا ہے۔

ایک دفعہ آپ لاہور میں عشرۂ محرم پر تشریف لائے تھے تو بعد اختتام مجلس میں نے آپ سے دریافت کیا کہ رونے سے مرنے والے کو کیا فائدہ پہنچتا ہے تو آپ نے جواب میں کہا تھا کہ

''فقط اعزازِ میت ہے''۔ ظاہر ہے کہ اس سے رونے والے کو بھی کچھ فائدہ نہیں پہنچتا ہے، فقط مرنے والے کے ساتھ اس کے تعلق اور ہمدردی کو ظاہر کرتا ہے۔

میں اس بات کا قائل ہوں کہ حضرت امام حسینؑ کی یاد کسی نہ کسی صورت میں قائم رکھنی چاہئے کیوں کہ انہوں نے جو کام کیا ہے وہ کسی بشر سے نہیں ہوسکتا معلوم نہیں کہ اور لوگ کس بات کو اہمیت دیں، مگر میرے نزدیک ان کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ یزید اپنی تمام قوت اور لاؤلشکر کے باوجود ان کی قوت ارادی کو نہیں توڑ سکا اور یہی کسی بڑے آدمی کی عظمت کی دلیل ہے کہ جس بات کو درست سمجھ لیا اس سے ایک انچ قدم پیچھے نہیں ہٹے، اگرچہ مصائب کے پہاڑ ان پر ٹوٹے۔ اسی واسطے خواجہ اجمیری علیہ الرحمہ نے کہا:

سرداد نداد دست دردست یزید
حقا کہ بنائے لاالٰہ است حسینؑ

اور علامہ اقبالؔ نے کہا:

بحر حق در خاک و خوں غلطیدہ است
پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است
تیغ بہر عزت دین است و بس
مقصدِ او حفظِ آئین است و بس

یہ بات مسلم ہے کہ حضرتؑ نے شہادت دین کی خاطر برداشت کی یعنی ان کا نصب العین دین کی حفاظت تھا۔ اس واسطے جو مجالس امامؑ کی یاد میں قائم کی جائیں ان کا نصب العین احیائے دین ہونا چاہئے نہ کہ فقط گریہ کے واسطے۔

موجودہ صورت یہ ہے کہ ایسے مجالس کا نام ''مجلس عزا'' رکھا گیا ہے اور ان کی غرض ہی واقعات کربلا کو یاد کر کے رونے رلانے کی ہے۔ میرے خیال میں اس جگہ اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس مجلس کا نام ''مجلس حسینؑ'' ہونا چاہئے اور اس میں کل دین پر بحث ہونا چاہئے تا کہ عوام اصل دین سے واقف ہو جائیں کیوں کہ شیعہ مذہب کی تعلیم کے لئے ضروری درس گاہیں نہیں ہیں۔ سرکاری اسکولوں میں بھی ان کے مذہب کی تعلیم کورس میں نہیں ہے۔ اس واسطے عوام صرف مجالس ہی میں اپنے دین سے واقف ہو سکتے ہیں اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے جب کہ علماء اس طرف متوجہ ہوں۔ ان کی کوشش بھی عموماً رونے رلانے کی ہوتی ہے اور اسی مجلس کو کامیاب مجلس سمجھا جاتا ہے جس میں گریہ خوب ہو۔

رونا کوئی گناہ نہیں ہے اگر کسی پر واقعات سننے سے گریہ طاری ہو تو بالکل صحیح ہے مگر یہ گریہ نصب العین رکھ کر مجلس بپا کرنا کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

اس گریہ کے جواز میں یہاں تک تاثر دیا گیا ہے کہ اگر کوئی مجلس عزا میں روئے یا رلائے تو اس پر جنت واجب ہوجاتی ہے۔ اگر کوئی ایسی روایت کسی امامؑ کی جانب منسوب کی جاتی ہے تو یہ قرآن مجید کے متضاد ہے۔ اس میں تو بار بار نماز اور دیگر امور شرعی پر زور دیا گیا ہے اور یہ کہیں نہیں کہا ہے کہ شہید راہِ خدا پر گریہ سبب بخشش ہے۔

شیعہ عوام نے اس روایت کا بہت اثر لیا ہے اور انہوں نے اصول شرعی اور مثلاً نماز روزہ وغیرہ سے بے نیازی اختیار کر لی ہے۔ یہ تاثر دور کرنے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک میری معلومات ہیں، عوام الناس کا سوائے مجلس عزا کے اور کسی طرف رجحان نہیں ہے۔ دوسرے احکام دین کی شاید انہیں خبر ہی نہیں یا وہ اس طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ عام لوگوں کو شاید باقی ائمہؑ کے ناموں کا پتہ بھی نہ ہو کیوں کہ مجالس میں عموماً سوائے واقعہ کربلا کے اور کوئی ذکر نہیں آتا ہے۔

عزا کو نصب العین بنانے سے ایک اور قباحت یہ ہوئی ہے کہ بہت سے افسانے بنا لئے گئے ہیں تا کہ رونا آسکے۔ واقعات کربلا کے چھوٹے چھوٹے جزئیات کی تفصیل، باہمی گفتگو اور رجز کی تفصیل، کس نے کس کو قتل کیا، جسم پر زخموں کی گنتی اور بے شمار اس قسم کی چیزیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت امام حسینؑ کی طرف سے سوا امام زین العابدینؑ کے اور کوئی بالغ مرد نہیں بچا

تھا۔ امام زین العابدینؑ خیمہ میں بیمار تھے۔ مستورات پردہ میں تھیں۔ میدانِ کارزار اگرچہ خیموں سے بہت دور نہیں ہوگا مگر اتنا قریب بھی نہیں ہوگا کہ دشمن کی سپاہ کے ساتھ جو گفتگو ہوتی ہو وہ حرف بحرف خیمہ جات میں سنائی دیتی ہو۔ اس واسطے معلوم ہوتا ہے کہ گریہ کو مدنظر رکھتے ہوئے تصور سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ یہ شبہہ اس لئے گزرتا ہے کہ اہل بیتؑ کے دمشق میں اسیری کی مدت میں بھی اختلاف ہے۔ حالانکہ یہ ایسا تاریخی واقعہ ہے جس کو سیکڑوں نہیں، ہزاروں لوگوں نے دیکھا ہوگا اور جن لوگوں پر وہ مصیبت آئی وہ اس اسیری کے بعد بھی زندہ رہے۔ پھر بھی میعاد اسیری میں شدید اختلاف ہے۔ صحیفۂ کاملہ سید قائم رضا نسیمؔ امروہوی نے لکھی، جو یہاں لاہور میں شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشر نے شائع کی ہے، اس میں حضرت امام زین العابدینؑ کی دعاؤں کے علاوہ ان کی سوانح عمری بھی ہے۔ اس کے صفحہ ۱۳۱ر۴ کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:۔

اسیری علی ابن الحسینؑ کی مدت

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ علیؑ ابن الحسینؑ کتنے عرصہ شام میں قید رکھے گئے؟ اس سلسلہ میں مورخین نے مختلف اور متضاد باتیں کہی ہیں۔ بعض نے مدت نو ماہ، بعض نے دو ماہ، بعضوں نے چالیس روز لکھی ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ صرف ۹ر دن قید رہے۔ اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے چند باتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱) اسیرانِ اہل بیتؑ شہادت امام حسینؑ کے بعد ۱۱ر محرم ۶۱ھ کو کربلائے معلٰی سے دمشق کی جانب روانہ ہوئے تھے۔

(۲) ۱۴ر ربیع الاول ۶۰ھ کو یہ قافلہ دمشق پہنچا تھا۔

(۳) جابر بن عبداللہ انصاری بیان کرتے ہیں کہ جب میں صفر ۶۱ھ کو کربلائے معلٰی میں زیارت امامؑ کے لئے پہنچا ہوں تو اسی روز امام زین العابدینؑ بھی مع اہل حرم قید سے چھوٹ کر واردِ کربلائے معلٰی ہوئے تھے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ آپ کم وبیش ۲۰ر ذی الحجہ کو دمشق سے عراق روانہ ہو گئے ہوں گے اور رہائی کے بعد چار چھ دن دمشق میں بھی ٹھہرے ہوں گے جیسا کہ کتب مقاتل میں بھی مذکور ہے۔

۱۴ر ربیع الاول سے ۲۰ر ذی الحجہ تک ۹ر ماہ اور چند دن کی مدت ہوتی ہے۔ اس حساب سے ۹ر ماہ زندانِ شام میں مقید رہنے کے قرائن زیادہ قوی ہیں اور ہمارے نزدیک یہی درست ہے۔ اس کے علاوہ اس سلسلہ کے باقی اقوال خلاف قیاس اور غلط ہیں۔

اقتباس ختم ہوا۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ایک بین واقعہ جس کو سیکڑوں ہزاروں اشخاص نے بذاتِ خود دیکھا ہوگا، اپنے اندر کس قدر اختلاف رکھتا ہے حالانکہ اس کے دیکھنے والے بعد ازاں زندہ موجود تھے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ امام زین العابدینؑ نے واقعات کربلا اور اسیری کی سرگزشت خود نہیں لکھی ہے حالانکہ وہی سب سے معتبر شہادت ہوتی۔

صرف یہی نہیں کہ گریہ کے لئے وضعی روایات بنالی جاتی ہیں بلکہ بعض اوقات نیم خواندہ ذاکر ایسی روایات بیان کرتے ہیں جن سے خود اہل بیتؑ کی اہانت اور تضحیک ہوتی ہے اور جو کسی طرح سے ان کے شایانِ شان نہیں ہوتیں۔ ان جملہ امور کا سدِّ باب لازمی ہے کیوں کہ مذہب کو مسخ کیا جارہا ہے اور مذہب کو صحیح راستے پر چلانے کی ذمہ داری بھی علمائے کرام پر آپڑتی ہے۔

عزا کو اتنی اہمیت دے دی گئی ہے کہ مجلس عزا میں سال بھر بے شمار روپیہ قوم صرف کرتی ہے جب کہ موجودہ زمانہ میں ترویج مذہب کے بیشمار طریقے اور بھی ہیں جن کی طرف کچھ توجہ نہیں کی جاتی اور جن پر خرچ کرنے کی عادت نہیں ہے اور ایسے خرچ کو بوجھا خیال کیا جاتا ہے۔ آج کل مروجہ تعلیم کی بے حد ضرورت ہے تا کہ مختلف ممالک میں مشنری کی حیثیت سے اور نئے تعلیم یافتہ طبقہ تک اپنے خیالات مؤثر انداز سے پیش کئے جا سکیں۔ اس کے لئے اپنے اسکول اور کالجوں کا اجرا ضروری ہے جہاں اپنے نقطۂ نظر کے مطابق تعلیم حاصل کی جا سکے۔ جماعت

احمد یہ جو کہ شیعہ جماعت کے مقابلہ میں ایک بہت چھوٹی جماعت ہے اپنے اسکول اور کالج رکھتی ہے مگر شیعوں کا کوئی قابلِ ذکر اسکول یا کالج نہیں ہے۔

اب جن اصلاحات کی ضرورت ہے:

اس کے لئے جذبات سے بالا تر ہو کر حقائق پر مبنی جوڈیشل ویو کی ضرورت ہے یعنی جس طرح عدلیہ جذبات سے الگ ہو کر ذاتی رجحان کو خیر باد کہہ کر حقائق پر مبنی اصلیت دریافت کرنے کی کوشش کرتی ہے، اسی طرح ہمیں دیکھنا ہوگا کہ شہادت امام حسینؑ نے کیا سبق دیا ہے؟ اسے ہمیں کس طرح سے اخذ کرنا چاہئے اور دوسروں تک کس شکل میں پہنچانا چاہئے؟ اس کے متعلق میری تجویز حسبِ ذیل ہے:

(۱) مجلسِ عزا کے نام کی جگہ ''مجلس حسینؑ'' نام ہونا چاہئے کیوں کہ امام حسینؑ کی شہادت کا مقصد کوئی مجلسِ عزا قائم کرنا نہیں تھا بلکہ جیسا کہ سب کو معلوم ہے اور میں پہلے لکھ چکا ہوں، احیائے دین تھا۔

(۲) مجلس حسینؑ میں اصول دین توحید سے قیامت تک اور فروعِ دین نماز و روزہ وغیرہ سب زیر بحث آنے چاہئیں اور وقتاً فوقتاً ہر ایک بات پر سیر حاصل تبصرہ ہوتا کہ سامعین اچھی طرح سمجھ جائیں۔ واقعات کربلا کا بیان اپنے موقع پر ہوتا رہے اور اس پر اگر کسی کو گریہ ہو تو درست ہے مگر واعظ کا نصب العین گریہ بالکل نہیں ہونا چاہئے۔

(۳) لوگوں کے ذہن سے یہ تاثر دور کرنا چاہئے کہ مجلس عزا یا گریہ باعث نجات آخرت ہے۔

نجات آخرت کے واسطے قرآن مجید میں واضح احکام ہیں۔ وہ کسی صورت میں پس پشت نہیں ڈالے جا سکتے۔ عوام الناس نے گریہ اور بکا کو اتنی اہمیت دے دی ہے کہ اصل احکام شرعی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں ہے۔ ماتمی جلوس چلتا جائے گا، نماز کے لئے اذان ہوگی، مگر بہت تھوڑے لوگ نماز کی طرف متوجہ ہوں گے۔ اس سے دوسروں پر کیسا اثر پڑتا ہے؟ حالانکہ جو کچھ لڑائی وغیرہ تھی نماز کو قائم کرنے کے واسطے تھی اور امام حسینؑ نے خود ایسے وقت میں نماز ادا کی جب کوئی بشر نہیں کرسکتا تھا، مگر واعظ اس طرف لوگوں کو بہت کم متوجہ کرتے ہیں۔

(۴) مجالس حسینؑ جس طرح میں نے لکھا ہے کثرت سے تمام سال ہونی چاہئے کیوں کہ شیعوں کے کوئی ایسے اسکول اور کالج نہیں ہیں جہاں وہ با قاعدہ علم دین حاصل کر سکیں۔ صرف مجالس ہی یہ کمی پوری کر سکتی ہیں۔

یہ تو ان مجالس سے متعلق تھا جو کہ تمام سال وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہیں۔ عشرۂ محرم کے مجالس کے متعلق بھی کم وبیش یہی اصول ہونا چاہئے۔ ان میں کسی قدر رقت انگیز عنصر زیادہ شامل کیا جا سکتا ہے۔

جلوس ہائے عشرۂ محرم

بروز عشرہ جلوس ضروری معلوم ہوتا ہے کیوں کہ انہیں جلوسوں سے عوام الناس کو واقعۂ کربلا کا علم ہوا ہے ورنہ دیگر ائمہؑ بھی شہید ہوئے ہیں اور عوام کو ان کی تاریخ شہادت کا بھی پتہ نہیں ہے۔ جلوس کے لئے ضروری ہے کہ کچھ ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ ان سے واقعات کربلا کی تصویر سامنے آ سکے جیسے علم، تعزیہ، ذوالجناح وغیرہ۔ بغیر ان کے اگر ایک لوگوں کا گروہ یوں ہی چلتا جائے تو وہ کسی کو کچھ متاثر نہیں کر سکے گا۔ علم فوج کا نشان ہے اس واسطے علم کی نقل بنائی جا سکتی ہے۔ اسی طرح سے تعزیہ روضۂ اقدس کی نقل ہے وہ بھی ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔ دلدل پر بظاہر کچھ اعتراض ہوسکتا ہے مگر یہ صرف سطحی اعتراض ہوگا کیوں کہ ہم آج کل کے زمانہ میں بھی دیکھتے ہیں کہ جب کوئی بادشاہ یا بہت بڑا سپہ سالار وفات پاتا ہے تو اس کی میت کو جب دفن کرنے کے لئے لے جاتے ہیں تو علاوہ اور لوگوں کے اس کا وہ گھوڑا پورے ساز وسامان کے ساتھ جس پر مرنے والا زندگی میں سواری کرتا رہا ہے جنازہ کے ہمراہ لے جایا جاتا ہے۔ شاہان انگلستان میں ابھی تک یہی رواج ہے۔ اس واسطے تعزیہ کے ساتھ اگر شبیہ ذوالجناح ہو تو کچھ ہرج نہیں ہے جب ہم ان کو امامؑ کی جانب منسوب کرتے ہیں تو اس نسبت سے یہ چیزیں قابلِ احترام تو ہو جاتی ہیں مگر

میرے خیال میں یہ شعائر الٰہیہ کی تعریف میں نہیں آتیں۔ شعائر الٰہیہ کی تعریف میں صرف وہی چیز آئے گی جس کو بحکم خدا یا رسولؐ شعائر الٰہیہ میں شامل کیا گیا ہو یعنی جس کے واسطے کوئی نصِ قرآنی موجود ہو یا کوئی حدیث۔ قربانی کے جانور وغیرہ قابلِ احترام ہیں، اس کے لئے نصِ قرآنی موجود ہے۔ کسی چیز کو ہم اپنی طرف سے کسی بزرگ ہستی کی طرف نسبت دے کر محض قیاس کی بنا پر اسے شعائر اللہ میں داخل نہیں کر سکتے۔ اگر اس طرح سے اجازت ہو تو یہ سلسلہ لا متناہی ہوگا اور اس کی کوئی حد نہ رہے گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ علم، ضریح اور ذوالجناح کا رواج ائمہ معصومینؑ سے بعد کا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ کس طرح سے شروع ہوا۔ شاید کسی مجتہد یا بڑے عالم دین نے اجازت دے دی ہو۔ جس نے بھی کیا یہ درست ہی ہے کیوں کہ یہ بڑی معصومانہ چیزیں ہیں اور جلوس کے لئے ان کی اہمیت مسلم ہے۔ البتہ یہ چیز قابلِ غور ہے کہ ہم اس حد تک جا سکتے ہیں کہ نذر کے طور پر ذوالجناح کے نیچے سے بچوں کو گزاریں یا کوئی اس قسم کی منتیں مانیں؟ مذہب اسلام کی جو بنیادی اسکیم ہے یا جو اس کا ڈھانچہ ہے ان میں شاید اس قسم کی منتوں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو کیوں کہ بعض اوقات یہ منتیں شرک کے حدود کو چھونے لگتی ہیں مگر اس کی اصلاح تو علماء ہی انہیں مجالس کے ذریعہ کر سکتے ہیں اور عوام الناس کے لئے اس میں انہیں کی بات موثر ہوتی ہے البتہ پنجتنِ پاک اور ائمۂ معصومینؑ کی وساطت سے خداوند عالم سے دعائیں مانگی جا سکتی ہیں۔

ہمارے یہاں پاکستان میں قائداعظم محمد علی جناح اور ڈاکٹر محمد اقبال کی سالانہ یاد منائی جاتی ہے بلکہ ان ایام میں تعطیل بھی ہوتی ہے اس لئے کہ انہوں نے قوم کے لئے بڑا کام کیا ہے۔

امام حسینؑ نے تو دین اور ملت کے لئے ان سے بہت بڑھ کر کام کیا اور بے حد قربانی دی اس واسطے ان کی یادگار قائم کرنے میں کسی صحیح الدماغ شخص کو کیا اعتراض ہونا چاہئے۔

خواہ آپ مجھ سے اتفاق کریں یا اختلاف مگر آپ کے جواب سے میرے بہت سے شبہات دور ہو جائیں گے۔

دعا گو

سید سرفراز حسین

الجواب

(از قلم آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ)

یادگار کے متعلق میرے استدلال میں جو منطقی سقم آپ کو محسوس ہوتا ہے، جب آپ اس کا نام نہیں لیتے تو اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کیا کہا جا سکتا ہے۔ مگر ممکن ہے آپ کے ذہن میں وہ چیز ہو جس کا نام ہمارے یہاں ''قیاس مع الفارق'' ہوتا ہے مگر جو فرق آپ نے بتلایا ہے وہ درست نہیں ہے۔

یہ کہ ''حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اور واقعۂ کربلا کا نہیں ہے۔'' یہ فرق اس وقت اثر انداز ہوتا جب اصل واقعۂ کربلا کا وقوع محل بحث ہوتا لیکن اصل وقوع جب مسلم ہے تو دونوں واقعوں میں کسے اہمیت زیادہ حاصل ہے اس کا دونوں واقعوں کے تفصیلات کو دیکھ کر ہر شخص اپنے ضمیر و وجدان سے فیصلہ کر سکتا ہے جب کہ وجدانی طور پر خصوصیات قربانی کے لحاظ سے یہ واقعہ قربانی جناب اسماعیلؑ سے زیادہ اہم ہے تو جس طرح قرآن کے حکم: **لا تقل لهما اف** سے ضرب و شتم اور ایسے کام جو شدید ترین مراتب ایذا کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی ممانعت ثابت ہوتی ہے جسے مفہوم موافقت کہتے ہیں اور وہ اس قیاس میں داخل نہیں ہے جو صرف بر بنائے گمان حکم کی ایک علت تجویز کر کے اس کے اشتراک پر مبنی ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں انہیں دلائل سے جو یادگارِ اسماعیلؑ کے قیام کا پتہ دیتے ہیں واقعۂ کربلا کی یادگار کے قیام کی ضرورت ثابت ہوگی جس کے لئے الگ سے کسی مزید دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

رہ گیا یہ کہ نام لے کر نہ سہی، عموماً تو قرآن میں یہ ہوتا کہ کسی شہید راہِ خدا کی جسے اہمیت حاصل ہو، یادگار قائم کر لینا تو اس کے لئے: **ذکر هم بايام الله** موجود ہے کسی عظیم شہید کی شہادت ایسی چیز ہے جس سے دینِ الٰہی کی حقانیت نمایاں ہوتی ہے۔ اور

جب ''ذکر'' کا حکم اس کے تذکرہ کا متقاضی ہے تو اس میں لفظی تذکرہ بھی شامل ہے اور عملی بھی جس کا نام ''یادگار'' ہوتا ہے۔

یہ کہ جناب حمزہؑ کی سالانہ یادگار نہیں قائم ہوئی اور جناب جعفرؑ کی نہیں ہوئی وغیرہ، یہ ایراد تو اس وقت درست ہوتا کہ جب کوئی کلیہ ایسا قائم کیا جاتا کہ ہر شہید کی یادگار قائم ہونا لازمی ہے لیکن جب کہ شہادت کے مراتب مختلف ہیں اور حالات و نتائج کے لحاظ سے خصوصیات بھی الگ الگ ہیں تو کسی اور شہید کی یادگار قائم نہ ہونے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ جو منفرد حیثیت رکھتی ہے اس کی بھی یادگار قائم نہ کی جائے۔

رسولؐ کی بشریت کو ہم ان کی رسالت سے الگ نہیں سمجھتے لہٰذا ان سے بتقاضائے بشریت جو عمل ہو، وہ بھی صحت عمل کی مسند قطعی بننے کا مستحق ہے۔

بعد کے معصومینؑ کا ایام عاشورا میں خصوصیت سے مظاہر حزن وملال ثابت ہے اور عمل عاشورا اور زیارت روز اربعین وغیرہ بھی اس کی سالانہ یاد کے متعلق اہتمام کی دلیل ہیں۔

واضح ہونا چاہئے کہ ذوالجناح یا تعزیہ کی اس سلسلہ میں کوئی خاص خصوصیت نہیں ہے۔ یہ چیزیں ہمارے ملک (غیر منقسم ہندوستان) کے ذوق کے لحاظ سے اختیار کی گئی ہیں۔ اصل چیز جس کا نام ''عزاداری'' ہے، وہ معصومینؑ کے دور میں بھی تھی اور اب بھی ہے اور ہر اہل بیتؑ سے وابستگی رکھنے والے ملک میں ہے۔ اس کی جو شکل ہمارے ملک میں اختیار کی گئی وہ تعزیہ وغیرہ کی صورت سے ہے لہٰذا ان چیزوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ کسی نصِ معصوم کا مطالبہ غلط ہے۔

بے شک جس طرح عبادت سے اللہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، بندہ کی عبودیت کا تقاضا پورا ہوتا ہے اسی طرح گریہ سے حضرت سید الشہداؑ کو کوئی فائدہ نہیں ہے، ہماری ولا کا تقاضا پورا ہوتا ہے۔

خود آپ نے حضرت امام حسینؑ کی یاد کے قیام کی ضرورت واہمیت پر جو کچھ لکھا ہے وہ اس سوال کے جواب کے لئے کافی ہے کہ حضرت حمزہؑ وغیرہ دیگر شہداؑ کی یادگار اس طرح قائم نہیں ہوتی تو امام حسینؑ کی یادگار کیوں؟

بات یہ ہے کہ دیگر شہداء کے یہاں صرف شہادت ہے اور یہاں اس کے ساتھ ایک بے مثال کردار بھی ہے جو قیامت تک کے لئے نشانۂ پیروی بننے کا مستحق ہے۔

یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ کارنامۂ حسینی کا مقصد احیائے دین تھا اور مجالس کا مقصد بھی احیائے دین ہونا چاہئے لیکن یہ مقصد مجالس سے بالواسطہ متعلق ہوتا ہے یعنی کارنامۂ حسینی چونکہ احیائے دین کے لئے تھا اور اب اس احیائے دین کا بہترین ذریعہ کارنامۂ حسینی کی یادگار قائم رکھنا ہے ------ مجالس اس کارنامۂ حسینی کی یاد قائم رکھنے کے لئے ہیں اور چونکہ جس چیز کی یہ یاد ہے وہ کوئی طرب انگیز (معاذ اللہ) داستان نہیں ہے بلکہ انتہائی شدید الیمہ ہے جس کی یاد کو آنسوؤں کی بارش کے ساتھ ہونا چاہئے۔ اس لئے اس میں تاثرات غم کا جو فطری طور پر گریہ آور ہوتے ہیں، قائم رکھنا ضروری ہے اس لئے احیائے دین اس گریہ کے مقابل کوئی چیز نہیں بلکہ ان مجالس میں لازم وملزوم کی حیثیت سے ہو گیا ہے۔

گریہ کو باعث بخشش بتانا اسی طرح ہے جیسے فریقین کے یہاں بعض دعاؤں، بعض وظیفوں اور بعض مستحبی نمازوں میں ہے کہ وہ باعث مغفرت ہوتی ہیں، یہاں تک کہ بعض اوراد میں یہ ملتا ہے کہ پڑھنے والا اپنی جگہ سے اٹھے گا نہیں جب تک کہ اس کی مغفرت نہ ہو جائے۔ مگر اس سے یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ دیگر احکامِ شرعیہ کی پابندی کی اب ضرورت نہیں رہی۔ ویسے ہی فضائل گریہ سے یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا۔

واقعۂ کربلا کے تفصیلات میں معتبر اور غیر معتبر کی آمیزش

سے انکار نہیں، مگر سوال یہ ہے کہ مغازی رسولؐ اور تمام جنگوں میں اس طرح کے تفصیلات کیا تاریخ کا جزو نہیں بنے ہوئے ہیں؟ حالانکہ ان کے ماخذ بھی واقعۂ کربلا کے تفصیلات ہی کی طرح لامعلوم ہیں۔

جتنا کوئی معاملہ زیادہ اہم ہوگا اور نگاہِ خلق کی توجہ کا مرکز، اتنی ہی اس کے بیان میں مختلف ذہنوں اور زبانوں کی کارفرمائیاں زیادہ ہوں گی۔

روایات کے ابہام اور اختلاف میں بعد کے مساعد اور نامساعد حالات کا بہت بڑا دخل ہے۔

قید کی مدت میں اختلاف اس سے زیادہ عجیب تو نہیں ہے جتنا وفاتِ رسولؐ کی تاریخ میں اختلاف کا ہونا عجیب ہے۔

غیر ذمہ دار ذاکرین جو مجلس کی کامیابی کے لئے طبعزاد اضافے کرتے ہیں بے شک قابلِ اعتراض ہیں اور ان پر علماء کی جانب سے صدائے اعتراض بلند ہوتی رہی ہے۔

اپنے اسکولوں اور کالجوں کی ضرورت مسلم ہے لیکن انہیں عزاداری کا بدل سمجھنا غلط ہے۔

جو تجاویز پیش کئے گئے ہیں ان میں:

تجویز نمبر (۱) نزاعِ لفظی کی حیثیت رکھتی ہے جس کی علمی اہمیت کوئی نہیں ہوتی، مقصد نام سے وابستہ نہیں ہوتا۔ مجلس عزا کا قیام مقصدِ امام حسینؑ نہیں تھا تو ''مجلس حسینؑ'' کا قیام بھی تو آپ کا مقصد نہ تھا بلکہ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے مقصد احیائے دین تھا مگر یہ مقصد اب آپ کے کارنامہ کی یاد سے وابستہ ہو گیا ہے تو اس میں مجلسِ عزا یا مجلسِ حسینؑ کے نام سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

(۲) مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ اگر صرف اصولِ دین اور فروعِ دین کے بیان کے سننے کی دعوت دی جائے تو عوام کا کیا ذکر، خواص تک اور تعلیم یافتہ افراد بھی جو آپ کی طرح اس کی تبلیغ کرتے ہیں اس ذوق وشوق سے نہیں آتے جس طرح مجلسِ عزا یا محفل فضائل میں جب بلائے جاتے ہیں تو فضائل و مصائبِ معصومینؑ کے سننے کے لئے آتے ہیں اور زیادہ تر ایسے ہی افراد ہیں جو اس مجلس سے بددلی محسوس کرتے ہیں جس میں گریہ نہ ہو۔ اس لئے مجلس عزا بنام تبلیغ دین ہو تو اس سے وہ مقاصد پورے نہیں ہوتے جو تبلیغِ دین بنامِ مجلس عزا سے پورے ہوتے ہیں جن میں ضمناً توحید سے قیامت تک تمام اصولِ دین اور فروعِ دین سب ہی کا بیان ہوتا ہے جو آپ کا مطلب ہے مگر اس طرح نہیں جس طرح محسوس ہو کہ اصل مقصدِ اجتماع یہی ہے۔

(۳) اس تاثر کو بس اس حد تک دور کرنا بے شک لازم ہے جس سے یہ نتیجہ نکلے کہ وہ فرائض شرعیہ کو غیر ضروری خیال کرنے لگے ہیں لیکن فرائض شرعیہ کی اہمیت کے احساس کے ساتھ وہ اگر گریہ کو عبادت اور منجملۂ اسباب مغفرت سمجھیں تو اس میں کیا حرج ہے۔ ہاں نماز وغیرہ کی اہمیت کے متعلق جو آپ نے تحریر کیا ہے وہ درست ہے اور فرائض شناس مقررین خود مجالس عزا ہی میں ان باتوں پر زور دیتے ہیں۔

(۴) مجالس کی کثرت سے آپ کو خود کوئی اختلاف نہیں اور اس سلسلہ میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اور بحمد اللہ جلوسوں کے بھی آپ مؤید ہیں اور علم وتعزیہ وغیرہ کے بھی۔

جب کہ قرآن مجید نے شعائر کی کوئی فہرست پیش نہیں کی ہے بلکہ صفا و مروہ کو بھی کہا **من شعائر اللّٰہ** شعار اللہ میں سے ہیں'' اور قربانی کے جانوروں کے لئے بھی یہی کہا ہے **والبُدن من شعائر اللّٰہ** '' قربانی کے جانور شعائر خدا میں سے ہیں'' اس لفظ **مِن** سے خود یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ ان کے علاوہ چیزیں بھی

جواس نوعیت کی ہوں وہ شعائر اللہ میں داخل ہیں۔

جب کہ قرآن وحدیث نے اس پر کوئی حد قائم نہیں کی ہے تو اگر یہ سلسلہ لامحدود ہوتو اس میں خرابی کیا ہے؟

پھر یہ کہ جیسے قرابت کی کڑیاں ہوتی ہیں کہ دور ہوتی ہوئی اس درجہ تک پہنچ جاتی ہیں کہ قرابت کا تصور باقی نہیں رہتا، اسی طرح انتساب کی کڑیاں ہیں جتنی دور ہوں گی اتنا شعائر اللہ ہونے کی حیثیت میں ضعف پیدا ہوگا، یہاں تک کہ ایک منزل ایسی آئے گی کہ ذہن میں انتساب کا تصور پیدا نہیں ہوگا اور پھر شعائر الٰہیہ ہونے کا معیار ختم ہو جائے گا لہٰذا سلسلہ لا متنا ہی نہیں ہوگا۔

شرک کے حدود کیا ہیں؟ جب تک ان کا تعین نہ ہو آنکھ بند کر کے کہہ دینا کہ یہ رسمیں شرک کے حدود کو چھونے لگتی ہیں'' کوئی وقیع بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک مخصوص فرقہ کے پروپیگنڈے کی صدائے بازگشت ہے جو ''شرک شرک'' کی آواز بلند کر کے ان مراسم عزا کو ختم کرنا چاہتا ہے۔

چونکہ آپ ان مراسم عزا کو بحمد اللہ قائم رکھنے کے حامی ہیں اس لئے آپ کو اس امر کی طرف توجہ دلانا ہے کہ یہ ''منت مراد'' کا سلسلہ شرک ورک تو ہے نہیں کیوں کہ کوئی جاہل سے جاہل ایسا نہیں جو ان حضرات کو معاذ اللہ خدا کا مدمقابل سمجھتا ہو لیکن عوام کے ایک طبقہ اور بالخصوص غیر شیعہ اور غیر مسلم افراد میں یہی منت مراد ان مراسم کے قیام کا باعث ہے جس کی تائید مشاہدات سے ہوتی ہے کہ ایک کی مراد جو برآتی ہے تو وہ پھر بہت سوں کو اس عزا میں شرکت کی تحریک کا باعث ہوتی ہے لہٰذا اصلاح کے جذبہ میں اس کا کلیۃً ختم کر دینا درست نہیں ہے۔

والسلام

(ماخوذ از سرفراز محرم نمبر ۲۹ رذی الحجہ ۱۳۹۵ھ مطابق ۲ رجنوری ۱۹۷۶ء صفحہ ۵ رتا ۱۳ ر)

❁❁❁

(صفحہ ۴۴ رکا بقیہ [فتح مکہ سے کربلا تک]۔۔۔۔)

کان من ثقاۃ اھل السنہ'' وہ کہتے ہیں۔

''میں نے حضرت علیؑ کو خواب میں دیکھا۔ میں نے حضرت سے کہا آپ حضرات نے مکہ فتح کیا تو کہا جس نے ابوسفیان کے گھر پناہ لی وہ محفوظ ہے۔ پھر آپ کے فرزند حسینؑ پر کربلا میں وقت آپڑا تو ان پر ظلم کی انتہا ہوگئی۔ امیر المومنینؑ نے فرمایا تم نے اس موضوع پر ابن صیفی کے شعر نہیں سنے؟ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا ان سے سنو، پھر میں بیدار ہوگیا۔

شیخ نصر اللہ فوراً ہی حیص بیص کے گھر گئے، حیص بیص سے ملاقات ہوئی تو اس خواب کا ذکر کیا۔ حیص بیص یہ خواب سن کر بلند آواز سے رو پڑے اور گریہ گلوگیر ہوگیا اور بحلف کہا کہ ابھی تک نہ تو میں نے یہ نظم کسی کو سنائی ہے اور نہ لکھ کر بھیجی ہے اور آج ہی رات کو میں نے اسے نظم کیا ہے۔ پھر اپنی نظم سنائی۔

ملکینا فکان العفو منا سمیة

فلما ملکتم سال بالدم ابطح

رحللتم قتل الاساریٰ وظالما

غددنا علی الاسریٰ تعف وتصفح

مجسکم هذا التفاوت بیننا

وکل اناء بالذی فیه ینضح

(۲۶۱ ۳ وفیات الاعیان ابن خلکان مطبوعہ مصر ۱۲۹۹ھ)

اقتدار ہمارے ہاتھ آیا تو عفو و درگذر ہماری خصلت ظاہر ہوئی، جب تم صاحب اقتدار ہوئے تو پتھریلی زمین پر خون کا سیلاب بہ گیا، تم نے ہمارے اسیروں کو قتل کیا اور ہم نے تمہارے اسیروں کو معاف کر دیا۔ یہ ہمارا تمہارا فرق ہے جس برتن میں جو ہوتا ہے وہی اس سے ٹپکتا ہے۔

(مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ)

❁❁❁